JULY
2022

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

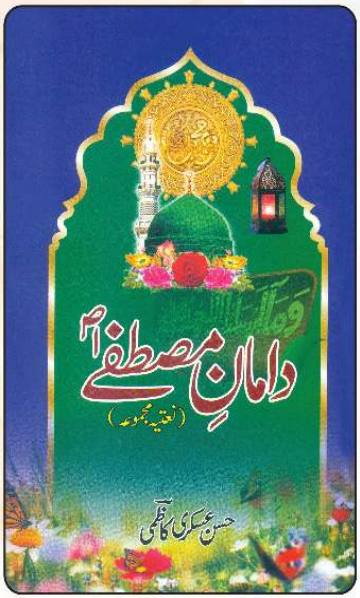
دامانِ مصطفیٰ ﷺ
(نعتیہ مجموعہ)
حسن عسکری کاظمی

یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے
از
محمد حنیف

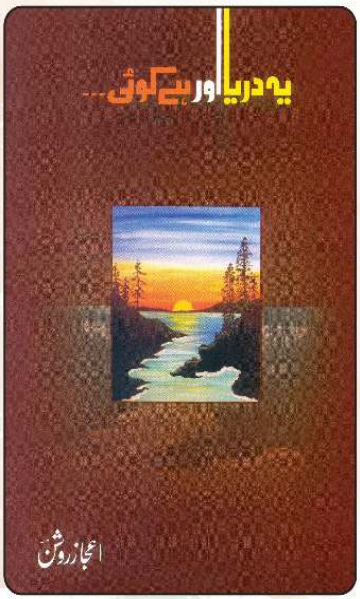
یہ دریا اور بے کوثی...
اعجاز روشن

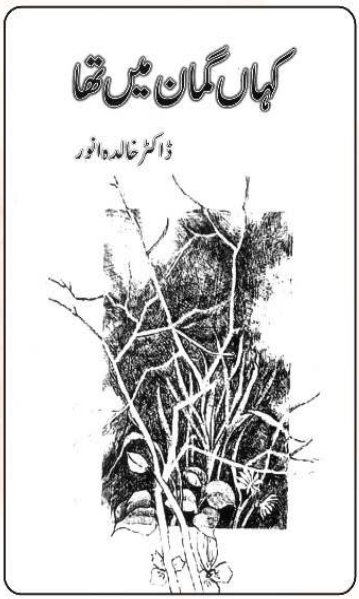
کہاں گمان میں تھا
ڈاکٹر خالدہ انور

حد

چوکھٹے بھی وہی دیواریں بھی
صرف تصویر بدل سکتی ہے
کچھ بدلنے کی نہیں آزادی
صرف زنجیر بدل سکتی ہے

۱۹۶۵

دب گیا ملبے تلے آپ ہی معمار اگر
گر پڑی مجھ پہ مری سوچ کی دیوار اگر
گرچہ نادم ہوں، مگر آج بھی اس سوچ میں ہوں
چھین لیتا مرا دشمن مری تلوار اگر

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا شماریہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 30 - جولائی 2022 - شمارہ نمبر: 7

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: عیدالاضحیٰ مبارک

قیمت: 100 روپے

سالانہ زرِ اعانت 1000 روپے بیرونِ ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 37512517-42-92

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر رائل پارک نزد سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	جلیل عالی، سرور حسین نقشبندی	7 تا 8
2	نعت	نسیم سحر، محمد یٰسین قمر، خاور اعجاز، عقیل رحمانی، ریاض ندیم نیازی، مظہر حسین مظہر	9 تا 14
3	قطعات	انعام الحق جاوید	15
4	مضامین	ابدال بیلا، خورشید ربانی، ہارون الرشید، شاعر علی شاعر، ظفر معین بلے جعفری، شاہدہ دلاور شاہ، سعدیہ بشیر، ناصر نقوی، فیصل زمان چشتی، خرم خرام صدیقی، (محمد حفیظ خان+رخشندہ نوید)، اعجاز رضوی	16 تا 87
5	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	88 تا 96
6	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، انور شعور، جلیل عالی، جمیل یوسف، عزیز اعجاز، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، باقی احمد پوری، گلزار بخاری، خالد علیم، یعقوب پرواز، تاثیر نقوی، خاور اعجاز، احمد جلیل، منظور ثاقب، اکرم ناصر، آغا نثار، اقبال سروبہ، راحت سرحدی، اوصاف شیخ، حسین سحر، شکیل جاذب، شہزاد نیر، ذکی طارق، شوکت محمود شوکت، اسلام عظمی، اظہر حسن، طالب انصاری، مسعود احمد، فہیم شناس کاظمی، اشرف کمال	97 تا 191

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
6	غزلیں	طلعت شبیر، محمد نوید مرزا، رخشندہ نوید، صائمہ آفتاب، ملیحہ سید عزیز فیصل، شبہ طراز، فیصل ہاشمی، اعجاز روشن، سعدیہ بشیر رضا اللہ حیدر، عمران اعوان، دانش عزیز، وسیم جبران، توقیر عباس صغیر احمد صغیر، سید فرخ رضا ترمذی، افتخار شاہد، ظہور چوہان رفعت وحید، ارشد محمود ارشد، فیض رسول فیضان، فیصل زمان چشتی علی رضا احمد، علی آرش، سید تحسین گیلانی، شاہد ماکلی اظہر عباس خان، اسد اعوان، شہاب اللہ شہاب، عزیز عادل گل فراز، امتیاز انجم، اکمل حنیف، بشیر احمد حبیب، الماس شمی سید ضیا حسین، ضیا الرشید، عاصم اعجاز، کیفی قلندر، اکرم جاذب محمد علی ایاز، اظہر حسین اظہر، عتیق احمد، امر مہکی، میتھو محسن امجد نذیر، رخسانہ سمن، علی رضا بلوچ، نادیہ سحر، لبنیٰ مقبول غنیم شفقت حیات شفق، جیا قریشی، نائلہ راٹھور، رداحاصل خلوص انتظار سید، عامر عباس، ناصر اعوان، علمدار حسین، عطا العزیز رانا محمد شاہد، شعیب عدن، قاسم حیات، علی حیدر علوی، اعجاز رضوی	97 تا 191
7	افسانے	بلقیس ریاض، پیروز بخت قاضی، تسنیم کوثر، شہزاد نصور	192 تا 215
8	شاعرِ امروز	عمار یاسر گمسی، احمد شہریار [شاہد ماکلی]	216 تا 223
9	نظمیں	امجد اسلام امجد، تابش کمال، شہزاد نیر، سید عارف معین بلے رخشندہ نوید، مرزا عاصی اختر، امجد بابر، سرور حسین نقشبندی زعیم رشید، غلام مرتضیٰ، زاہد ربانی، م ح مسرور، اعجاز رضوی	224 تا 236
10	خطوط	وردانہ نوشین خان، طالب انصاری، اشرف کمال فیض رسول فیضان، رانا محمد شاہد	237 تا 241

حمد

کوئی گورا کوئی بھورا کوئی کالا بنایا
بنایا اس نے جو جیسا بہت اعلا بنایا

اسی میں بہتریں تشکیل کی حکمت ہے پنہاں
کسی کو اس نے جس انداز بھی ڈھالا بنایا

نہ یہ سوچیں ہمیں رتبے میں کم کس کس سے رکھا
یہ دیکھیں اس نے کتنوں سے کہیں بالا بنایا

کرم اس کا ہمیں کارِ نیابت کی غرض سے
شعورِ حرف دے کر سوچنے والا بنایا

لہو میں ہُو کی لے بیدار ہو جائے تو اُترے
خود اپنی خواہشوں نے دل میں جو جالا بنایا

ہمیں ہر عہد میں محفوظ رکھنا تھا سو اس نے
ہمارے گرد نورِ ثور کا ہالہ بنایا

جو ہم ٹوٹی ہوئی تسبیح سا بکھرے تو پھر سے
بہ فیضِ سلکِ عشقِ مصطفیٰ مالا بنایا

جب اُس کے ہو گئے اک بار تو پھر اُس نے عالیؔ
سنوارا ہر طرح سے ہم کو اجیالا، بنایا

جلیل عالی

حمد

لب پر مرے جو ذکر و ثنا ہے خدائے پاک
تیرا کرم ہے تیری عطا ہے خدائے پاک

دونوں جہاں میں تیرا نہیں ہے کوئی شریک
خلقت کا ایک تو ہی خدا ہے خدائے پاک

ہر سو ترے ہی نور کے جلوے ہیں عکس ریز
ہر سمت تو ہی جلوہ نما ہے خدائے پاک

سب انبیاء رسل تری وحدت کے ہیں نقیب
سجدہ فقط تجھی کو روا ہے خدائے پاک

اس نے تجھے یقیں سے پکارا ہے بالیقیں
نخلِ مراد جس کا ہرا ہے خدائے پاک

تو ہی ہر ایک رنج و الم میں ہے دستگیر
تیری ہی یاد غم کی دوا ہے خدائے پاک

تیرے کرم سے میرا بھرم ہے جہان میں
ورنہ مری بساط ہی کیا ہے خدائے پاک

کھولے ہیں اس کی فکر پہ حمد و ثنا کے باب
سرور پہ تیری کتنی عطا ہے خدائے پاک

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

رحم ہم پر ہو اب اَے شہِ دَوسراؐ
ساری دُنیا ہے درپَے شہِ دَوسراؐ

ہو مجھے بھی عطا ، اَے شہِ دَوسراؐ
نعت کا لحن اور لَے، شہِ دَوسراؐ

صرف دو لفظ اس استغاثے کے ہیں
طرزِ غالبؔ میں 'ہَے ہَے'، شہِ دَوسراؐ

بس اُسی راستے پر رہوں گامزن
جو ہے میرے لیے طے، شہِ دَوسراؐ

آپ کی اک نگاہِ کرم کے عوض
لوں نہ ہرگز کوئی شے ، شہِ دَوسراؐ

اس خماری میں بھی ہوشمندی رہے
معرفت کی مِلے مَے، شہِ دَوسراؐ

آپؐ کے در پہ آؤں گا کس منہ سے مَیں؟
میری اوقات کیا ہے، شہِ دَوسراؐ؟

عرش تک بھی سُنے جائیں نالے مِرے
ایسی نالوں میں ہو نَے، شہِ دَوسراؐ

نسیمِ سحر

درود اُس ؐ پر، سلام اُس ؐ پر

درود اُس ؐ پر کہ نام جس کا زباں پہ آئے

تو جان و دل میں

سرور و بہجت کی ایک دنیا

وجود پائے

سلام اُس ؐ پر کہ جس کو سوچیں

تو جسم و جاں کی

ہر ایک رگ میں

سکینتوں کے ہزار جھرنے

نمود پائیں

درود اُس ؐ پر، سلام اُس ؐ پر

محمد یٰسین قمر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

منہ دیکھتے ہی رہ گئے جادو بیاں سبھی
لب گنگ ہو کے رہ گئے معجز سخن تمام

نعتؐ

قیدِ عُزلت سے رِہائی اُن کی ہے
جو ہُوئے اُنؐ کے، خدائی اُن کی ہے

یونہی تو کہتے نہیں خلقِ عظیم
فرش تا عرش آشنائی اُنؐ کی ہے

حق تعالیٰ نے بتایا راستہ
راستے میں رہ نمائی اُنؐ کی ہے

حضرتِ یزداں سے ربط و ضبط ہے
آخری حد تک رسائی اُنؐ کی ہے

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لکھتے ہی اُنؐ کا اِسم مُبیںؐ جھلملا اُٹھیں
عرشِ ورق پہ کاہ کشانِ سخن تمام

نعتؐ

لے کے آئی صبا مدینے سے
نور کا اک دیا مدینے سے

مہک آئی ہے پھر مدینے کی
کوئی آیا ہے کیا مدینے سے؟

چادرِ گمرہی میں لپٹا ہوا
ہو گیا پارسا مدینے سے

جان آنکھوں میں سب سمٹ آئی
جب ہوئے ہم جُدا مدینے سے

ہو رہی ہے جو نور کی بارش
آئی ہے یہ گھٹا مدینے سے

مل گئے فاطمہؓ ، حسینؓ و حسنؓ
اور مشکل کشا مدینے سے

لحد روشن رہی قیامت تک
فیض ملتا رہا مدینے سے

پہنچی بابِ قبول تک فوراً
جو بھی مانگی دعا مدینے سے

جیسے گل سے نکلتی ہو خوشبو
یوں ہوئے ہم جُدا مدینے سے

پھیلا ہے کربلا تا شام و نجف
نور کا سلسلہ مدینے سے

ڈر نکیرین کا عقیل نہیں
اپنا ہے رابطہ مدینے سے

عقیل رحمانی

نعتؐ

حضورِ خاص میں میرا مقام ہو جائے
اگر یہ زندگی آقاؐ کے نام ہو جائے

حضور آپؐ کا ہو جائے اک اشارہ فقط
تو میرا دونوں جہانوں میں کام ہو جائے

مدینے پاک میں روشن ہو میری صبحِ جمال
بقیعِ پاک میں جیون کی شام ہو جائے

حضورؐ آپؐ کی چشمِ کرم جو کُن کہہ دے
مری نجات کا اعلانِ عام ہو جائے

ہر ایک بات بنے اُس کی، جس کو دنیا میں
شعورِ مدحتِ خیرالانامؐ ہو جائے

خیالِ خام دلوں سے جو دُور ہو تو ندیم
ہر ایک شخص نبیؐ کا غلام ہو جائے

ریاض ندیم نیازی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر لفظ چاہتا ہے کہ اُس ذکر میں ڈھلے
دَر پر ہیں دست بستہ بتانِ سخن تمام

نعتؐ

لبِ حروف پہ ہے طُرفہ کپکپاہٹ سی
اتر رہی ہے خیالوں میں سرسراہٹ سی

ولائے آلِ عبا سے ملی سخن کو مرے
یہ آب وتاب یہ رونق یہ جگمگاہٹ سی

چٹک رہی ہیں دعاؤں کی شاخ پر کلیاں
ہر ایک شب میں شبِ قدر کی ہے آہٹ سی

قلم کو ملتا ہے جونہی ثنا گری کا اذن
لبوں پہ کھیلنے لگتی ہے گنگناہٹ سی

شکستگی سے بچا لیجیے حضورؐ ہمیں
نگل نہ جائے کہیں ہم کو بھربھراہٹ سی

درود پڑھ لیا مظہر سفر سے پہلے جب
تو مسکرا اٹھی رستے کی ہر رکاوٹ سی

حضورؐ عہدِ تصنع میں کھو گئی ہے حیات
ڈبو نہ دے ہمیں لہجوں کی یہ بناوٹ سی

حضورِ نعت میں کس لفظ کو کہاں باندھوں
ہمیشہ ہوتی ہے محسوس ہچکچاہٹ سی

جبین سائی کی توفیق بھی ملے یارب
رکھی ہے خواب منڈیروں پہ ایک چوکھٹ سی

خیالِ شہرِ نبیؐ میرے دل میں کیا آیا
بکھر گئی مرے چہرے پہ مسکراہٹ سی

مظہر حسین مظہر

قطعات

نصیحت بابا

تب جا کے اصلیت کھلی دنیا و دین کی
جس وقت سر میں بال سفید آنے لگ پڑے
پھر اس میں خود ہی سوچئے بوڑھوں کا کیا قصور
جب زندگی کو سمجھے تو سمجھانے لگ پڑے

اچانک

خطا ہوا ہے وہ کل مجھ سے اس طرح جیسے
بٹیرا ہاتھ میں آیا ہوا نکل جائے
کنارِ آب کسی آدمی کے ہاتھوں سے
حسین مچھلی کوئی جسطرح پھسل جائے

.....

دیتا ہوں سی ڈی اے کو میں ہر روز منتھلی
دیوار راستے کی گرا کر ہی اٹھوں گا
ٹھیلہ لگا لیا ہے ترے گھر کے سامنے
اب تجھ سے میں نکاح پڑھا کر ہی اٹھوں گا

دھرنا سیاست

کسی سائیکل نہیں کنٹینروں پہ چڑھ کے آیا ہوں
بڑی بولی لگا کر سب سے آگے بڑھ کے آیا ہوں
مجھے کمزور مت سمجھو، میں ویسے ہی نہیں آیا
سیاست کے اصولوں کا جنازہ پڑھ کے آیا ہوں

سرکاری دفتر

نہ عملہ ہے نہ گھنٹی ہے نہ کُرسی ہے نہ Peon ہے
کسی میں کام کرنے کی لگن ہے اور نہ ہمّت ہے
نہ کوئی out put ہے اور نہ ہی کوئی decision ہے
رپوٹیں ہی رپوٹیں ہیں revision ہی revision ہے

محبوبہ کا مکالمہ

سچ پوچھو تو ہر بندے کی نظروں میں
اس دنیا کا ہر بندہ ہی Mental ہے
کرنا مت apply اس کو اپنے پر
تیرا میرا کیس تو sentimental ہے
سُن کر میری باتیں ہنس کر بولی وہ
sentimental میں بھی شامل Mental ہے

انعام الحق جاوید

قدیم یونان

''قلوپطرہ'' تمہاری کہانی تم سے سننے سے پہلے، تمہیں ''یورپ'' کی وہ کہانی نہ سناؤں، جس سے ''یورپ'' کا نام ''یورپ'' پڑا، اور اس کی ''تہذیب'' کے خدوخال واضع ہوئے۔

مسکرا کیوں رہی ہو؟

جانتا ہوں، تم میں ''مصری'' خون سے زیادہ ''یونانی'' خون بولتا ہے۔ اُس زمانے میں ''یونان'' نے ''مصر'' کو کالونی بنایا ہوا تھا، مگر ''یونان'' ایران سے جنگوں کے نتیجے میں اپنی آن بان ختم کر چکا تھا۔ تمہارے وقت میں ''اٹلی'' سے ''روم'' کی قوت دنیا کو شکنجے میں لیے ہوئی تھی، یاد ہے جب تم صرف چودہ سال کی تھی، تمہارے والد جو ''مصر'' کے تاجدار تھے، وہ مارے مارے پھرتے، کہ کسی طرح ''روم'' انہیں، انہی کی طرف سے ''مصر'' پہ بیٹھ کے حکومت کرنے دے۔ خود ''روم'' سے فوجیں بھیج کے انہیں روند نہ ڈالے۔

یاد آیا؟

تم اپنے باپ کی سب سی بڑی بیٹی تھی۔ تم سے چھوٹے دو بھائی اور ایک بہن بھی تھی۔

ہے نا یاد،

مسکرا کیوں رہی ہو؟ قلوپطرہ

میں ابھی تمہاری کہانی تمہیں سناتا ہوں۔

جب ''ملکہ'' بننے کے لیے تم نے ایک کے بعد دوسرے اپنے دونوں بھائیوں سے شادی کی، کی تھی نا؟

لو تم ہنسنے لگی۔

مانتا ہوں، تمام ''فرعون'' یوں ہی کرتے تھے۔ دیکھ، تمہارے دور میں ''مصر'' کا صدر مقام پرانا ''میمفیس'' شہر نہیں تھا، جو آج کل کے ''قاہرہ'' کے قریب ہی ہوا کرتا تھا۔ تمہارے عہد میں ''مصر'' نے ایشیا کے بجائے ''یورپ'' طرف کھلتی کھڑکی کا دروازہ بنایا ہوا تھا۔

تمہارے شہر ''سکندریہ'' کی بات کر رہا ہوں۔

''سکندر اعظم'' نے اُسے آباد کیا تھا۔

کہنے کو ''نیل'' ڈیلٹا کی ایک شمالی خلیج اُس طرف بھی آتی ہے، ہے یہ سمندر کنارے بندرگاہ۔

تمہارے ''سکندریہ'' میں ''سکندر اعظم''

ابدال بیلا

نے جو ''لائٹ ہاؤس'' تعمیر کرایا، وہ بھی دنیا کے عجائب میں ایک ہے۔

دیکھو، رُخ بدلنے سے کتنا فرق پڑتا ہے۔

مجھے یاد ہے، بچپن میں ہمارے پڑوس میں ایک گھر تھا۔ اُس کا رہن سہن، اٹھنا بیٹھنا سب گلی کے دوسرے گھروں جیسا تھا۔ گلی کا ماحول سادہ اور پرانے انداز کا تھا۔ عورتیں سر اُوڑھ کے رکھتیں، مرد سرِعام تاک جھانک نہ کرتے۔ کسی نے کوئی نشہ کرنا ہوتا تو چھپ کے کرتا۔ لڑکی لڑکے چھپ چھپا کے اندھیرے میں اندھی راہداریوں میں ملتے۔

مگر ہمارے اُس محلے کے پچھواڑے میں ہمارے اُسی گھر کی پچھلی دیوار کے پار جو محلہ تھا، وہ رنگ و آہنگ سے بھرا، شوخ و چنچل۔ عورتیں اُدھر دوپٹہ گلے میں ڈال کے یوں بھاگتی دوڑتی، کہ وہ دوپٹہ اُن کے سینے کے ابھار اور اٹھا دیتا۔ اُن بھاگتی ست رنگی لڑکیوں کے پیچھے وہ پتلا شفون کا رنگا دوپٹہ اُن بھاگتی لڑکیوں کے بچکولے لیتے ''پَر'' دکھائی دیتا۔ لگتا وہ ''پریاں'' ہوں۔

سرِعام اُس محلے میں لڑکے لڑکیاں بیٹھ کے باتیں کرتے۔ مسکاتے، ایک دوسرے کو لبھاتے۔ اُن کے کپڑے بھی نت نئے فیشن میں ڈھلے ہوتے۔ اُن دنوں ''ٹیڈی'' کپڑوں کا فیشن تھا۔ لڑکیاں ایسی ''ٹائٹ'' قمیض پہنتی کہ اُن کا سینہ ابھر کے سامنے دندناتا۔ اُتنا وہ کپڑے اتار کے بھی نہ دکھائی دے۔ پھر اُن کی لمبی قمیض کولہوں سے اتنی تنگ ہوتی کہ سمجھ نہ آتی انہوں نے یہ قمیض پہنی کیسے؟ دونوں رانوں کو وہ قمیض کسی تنگ سے ''سکرٹ'' کی طرح جکڑ لیتی اور اُس کے اندر ''پنڈلیوں'' سے چپکی شلوار کے نیچے وہ اونچی ایڑھی کے جوتے پہن کے مورنی کی طرح پنکھ بکھیرے قدم قدم چلتی تو ان کا سینہ اور باہر کو نکل آتا۔ پیچھے سے کولہے اوپر اٹھ جاتے۔ یہ ''اونچی ایڑھی'' کے جوتوں کو پہن کی جسم کا فطری خودکار سنبھلنے کا انداز ہے۔

سمجھی!

تم سے زیادہ کون سمجھتا یہ، قلوپطرہ۔

بس اک پڑوسی نے، اپنی پچھلی دیوار کی کھڑکی کو توڑ کے اُس کا دروازہ بنا لیا۔ اُس کے گھر کی لڑکیوں اور لڑکوں پہ پچھلی گلی کا رنگ چڑھ گیا۔

''سکندرِ اعظم'' نے ''مصر'' کو فتح کر کے جب ''یونان'' کی طرف، مصر کے سمندری کنارے پہ ''سکندریہ'' آباد کیا تو اُس میں ''مصر'' کا رنگ نہیں، ''یورپ'' کا رنگ آیا۔

اب تمہارا چہرہ سوال بنا پوچھ رہا ہے، یہ ''یورپ'' کا رنگ ''یورپی'' کیسے ہوا۔

ہے نا یہی سوال، تمہارے ذہن میں قلوپطرہ؟

تو سنو۔

آج کے ''مصر'' اور ''لیبیا'' کی سمندری سرحد میں سامنے جو جزیرہ نظر آتا، وہ ''کریٹ'' ہے۔ اس جزیرے سے اوپر شمال میں یونان ہے۔ مشرق میں آج کا ترکی، اُس زمانے کا شہر ''ٹرائے''۔

مگر ابھی ''ایتھنز''، ''ٹرائے''، ''سپارٹا'' یہ سارے شہر پیدا نہیں ہوئے تھے۔

''یورپ'' کی ساری تہذیبوں میں یہ اولین ''تہذیب'' ہے اُن کی، جس کی بات کرنے لگا۔ اس جزیرہ کریٹ کے شمالی کونے پہ وہ شہر تھا۔ نام تو شہر کا، شہر والوں نے خدا جانے کیا رکھا تھا، جیسے ہمارے ''موہنجوداڑو'' میں، ادھر والوں نے اس سوہنے شہر کا نام، ''مرے ہوؤں کا ٹیلہ'' تھوڑی رکھنا تھا۔ خیر نام اُس کا جو بھی تھا، اُس شہر کے بادشاہ کا نام ''مینائس'' تھا۔ مگر کہانی ''بادشاہ'' کی نہیں اہم، اہم اُس کی ''ملکہ'' کی ہے۔

جیسے ''مصر'' کتنا بھی اہم سہی

مگر ''قلوپطرہ'' تمہاری داستان نے اسے رنگین کر دیا ہے۔ ہے نا؟

یونہی اُس شہر کی ملکہ نے اُس پورے براعظم کو اپنا نام بھی دیا اور اپنی خوش رنگی بھی۔

ملکہ کا نام تھا ''یورپا''۔

اب سمجھ آئی، ''یورپ'' لفظ کہاں سے آیا۔

''یورپا'' کا دیس۔

یورپا کو اُس عہد کے دیوتا ''زیوس'' سے عشق ہوا یا، زیوس اُس پہ عاشق ہوا، یہ معمہ ابھی حل نہیں ہوا۔ ہوا یوں کہ ''زیوس'' دیوتاؤں کا سرپنچ ''یورپا'' ملکہ سے ملنے کے لیے ''بیل'' کی شکل میں آتا اور ملکہ سے مباشرت کرتا۔ کہتے ہیں، یوں ملکہ نے ایک ایسے بچے کو جنم دیا جو گردن سے پیروں تک تو انسان دکھائی دیتا، مگر گردن سے اوپر اُس کا سر ''بیل'' کا تھا۔

بادشاہ نے اُس ''بیل نما عفریت'' کو ایک بھول بھلیوں کے اندر قید کر دیا۔

ملکہ ''بیل'' کے عشق میں اُس بھول بھلیوں میں جاتی، آتی اور کوئی اُدھر جاتا تو زندہ واپس نہ آتا۔

''بیل'' کے سینگ اُس شہر کے ہر گھر کی چھت پہ بنا کے سجائے گئے تھے۔ ''بیلوں'' کا اُدھر راج تھا۔ وہ ''مقدس دیوتا'' تھا، کھیلوں میں بھی ''بیلوں'' کے اوپر چھلانگیں مارنا، مردوں کی بہادری سمجھا جاتا تھا۔ ''ملکہ'' ''یورپا'' کی دیکھا دیکھی، شہر کی دوسری عورتیں بھی ''بیل'' سے ملکہ جیسا ''ٹچوگ'' بنا لیتی۔

ہنستی کیوں ہو؟ ہو سکتا، ہوتا تھا۔

اُس شہر کی لڑکیوں اور عورتوں کا لباس بھی انہونا تھا۔ وہ اوپر سینے پہ چھوٹی سی چولی پہنتی جس سے سینے کے ابھار اور ابھر کے ننگے تنے رہتے۔ کمر پہ وہ مردوں کی طرح لونگی سی پہن لیتی۔ وہ بھی ایسی کہ آگے پیچھے پھول کنارے کر کے سجا یا اک اک گول سا کپڑے کا ڈھکنا سا ہوتا، جیسے ''ناشتہ دان'' اوپر ''ٹوکوزی'' ہو۔

جیسے دعوت عام ہو، آؤ ناشتہ کرو۔

انہی کپڑوں میں ملبوس، آنکھوں میں کاجل لگائے، گالوں پہ غازہ ملے، ناچتی کھیلتی بھاگتی لڑکیوں کے مجسمے اُس شہر کے کھنڈرات سے ملے ہیں۔

وہ بڑا خوشحال شہر تھا۔

غلے کے ڈھیر تھے۔

فصلیں اُن کی زور آور تھیں۔

چاروں طرف سمندر سے مچھلیاں پکڑنے کا
بھی اُن میں رواج تھا۔
شاہی محلات کے سینکڑوں کمرے تھے۔
کمرے سے جڑا کمرہ۔
کمروں کی چھت میں ''روشن دان''۔
سیڑھی لگا کے وہ چھت سے جزیرے کا نظارا
کرتے۔ اُن لوگوں میں میلے ٹھیلے، ناچنے
گانے اور مل کے کھانا کھانے کے کئی بہانے
تھے۔ اُن کے محلات کی دیواروں پہ آبی
رنگوں سے اُس عہد کی ساری کہانی لکھی،
ہزاروں سال بعد پڑھی گئی۔
وہیں سے پڑھ پڑھ کے تمہیں بتا رہا ہوں۔
لو آؤ دیکھو وہ تصویریں۔
دیواریں برہنہ عورتوں کی تصاویر۔
خوش باش عورتوں کے قہقہے
مرد اور عورتوں کے مل کے مزہ لیتے دیتے
''بیل'' کے اوپر قلابازیاں کھاتے شہزادے۔
''منوآن'' تہذیب کی رنگارنگی اُن کی
دیواروں پہ لکھی، بنی، ہزاروں سال بعد عین
اُسی طرح دیکھی اور پڑھی گئی۔ ''منوآن''،
''کریٹ'' کی تہذیب میں عورت کو فوقیت
تھی۔ بادشاہ تھا، مگر راج ''رانی'' کا تھا۔
''ملکہ'' بیل پہ بیٹھی حکم چلاتی دیواروں پہ نقش
ہوئی ہوئی۔ کہتے ہیں، اُس ملکہ کی اک شہزادی
بھی تھی۔ تھی بھی ''قاو پطرہ'' تم جیسی سندر اور
چمکدار، چکنی اور گلابی۔
نام تھا شہزادی کا ''اَریاذ''۔
اُس پہ اک شہزادہ عاشق ہو گیا۔
شہزادے کا نام تھا ''تھیسز''۔
یہ جواب یونیورسٹی میں ''تھیسز'' لکھا جاتا،
اُسی کے نام سے آیا۔
بہت غور و فکر کیا تھا، اُس نے۔
بڑے پھیرے لگائے شہزادے نے،
شہزادی کے لیے۔ بس تانک جھانک اور
ذرا ذرا سی سرسری ملاقات سے زیادہ ''ملکہ''
نے شہزادے کو اپنی شہزادی سے ملنے نہ دیا۔
دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی۔
بڑھتی رہی۔
''ملکہ'' نے ایک شرط رکھی، کہا۔ بھول بھلیوں
یعنی ''لیبرنتھ'' کے اندر جا کے زندہ واپس
آؤ، اُدھر موجود ''بیل نما'' عفریت سے بچ
کے۔ وہ عفریت وہی تھا ''مینوتار'' جس کا
سر بیل کا، جسم ''بندے'' کا۔
شہزادہ مان گیا، کہ جاؤں گا اُدھر۔
شہزادی ڈر گئی۔
بولی، جو بھی اُدھر گیا وہ واپس نہیں آیا۔
شہزادہ بولا کیوں؟
شہزادی کہنے لگی، اُسے ''مینوتار'' مار دیتا اور
وہ ''بھول بھلیوں'' ''لیبرنتھ'' کا راستہ
بھول جاتا۔ بولی۔ ملکہ میری ماں۔
میں جانتی ہوں، وہ تمہیں مروانا چاہتی ہے۔
میں تمہیں گنوانا نہیں چاہتی۔ تم سے پیار
کرتی ہوں۔ شہزادی اُس وقت ''اُون'' کا
گولہ لیے شہزادے کے لیے ''سویٹر'' بُن
رہی تھی۔ شہزادہ بولا، فکر نہ کرو، زندہ واپس
آؤں گا۔ ''مینوتار'' کو ختم کر کے۔ تب تک

تم یہ سویٹر پورا کر لو۔ واپس آ کے پہنوں گا۔
شہزادی کی آنکھیں ایکا ایکی میں چمکیں۔
بولی، تم سویٹر کو چھوڑو۔
زندہ واپس آ گئے تو مجھے پہن لینا، پوری کی پوری کو۔
ابھی ایک تدبیر آئی ذہن میں، شہزادی سویٹر بُنتی بُنتی اُٹھ کے شہزادے سے لپٹ کے بولی۔
جا ہی رہے ہو تو یہ ''اُون'' کا گولہ ساتھ لے جاؤ۔ جدھر جدھر سے گزرو، یہ اُون کھولتے جانا۔ واپسی پہ اسی ''اون'' کے دھاگے کو ''رستہ'' سمجھ کے پلٹ آنا۔
لو، قلوپطرہ سمجھ آئی،
کبھی کبھی اُون کا دھاگا، زندگی بچانے والا ''رستہ'' بن جاتا ہے۔
شہزادہ مسکرایا۔ بولا، دو ''اُون'' کا گولہ، میں گیا۔
یوں، اُن ''بھول بھلیوں'' میں دھاگہ پھیلاتا وہ چلتا گیا۔ ''جادو'' کی تلوار بھی اُسے شہزادی نے دی تھی، جو شہزادی نے ایک ''جن'' کو خوش کر کے اُس سے لی تھی۔
یہ تو بتا قلوپطرہ، شہزادیاں کیسے ''جن'' کو خوش کرتیں۔
ہنس کیوں رہی۔
تم سے بڑی شہزادی کون؟ تم سے بڑی ملکہ کہاں؟ تمہارے لیے کتنی فوجیں لڑی مری۔
بس شہزادہ گیا۔
''مینوٹار'' سے لڑا۔
اُسے مارا۔ اور ''اُون'' کے دھاگے کا رستہ دیکھ دیکھ باہر آ گیا۔
شہزادی جیت لی۔
دیکھ میں، اُون کا گولا دیے بغیر، بغیر ''مینوٹار'' کے لڑے تمہیں مل گئی۔ تم نے کیا منتر پڑھا تھا؟
منتر تو پڑھا تھا ایک۔ قلوپطرہ، تم تک آنے کے لیے۔
زمان و مکان کے ''لیبرنتھ'' سے یونہی تو نہیں کوئی گزرتا۔ تمہیں پتہ تم تک پہنچنے سے پہلے بھی تمہارے ساتھ تمہارے ''نیل کنارے'' تمہارا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر چلا۔ بتاؤں کب کب؟ کن کن راستوں پہ تمہارا ہم سفر تھا؟
بول؟
اب کیوں ہنس کے روک رہی ہو۔
کہانی کہتا ہوں۔
کہتے ہیں، وہاں کا بادشاہ بھی اپنی ملکہ سے محل میں ملتے وقت ''بیل'' کا سر جیسا خول اپنی گردن اوپر چڑھا لیتا۔ اور ملکہ کو مقدس ''بیل'' جیسا احساسِ قرب دیتا۔
اب یہ نہ پوچھنا او رکہاں کہاں ''خول'' چڑھاتا۔ ہنس رہی، میری قلوپطرہ۔ دیکھ وہ ''منوآن'' کے باشندے تحریری رسم الخط بھی استعمال کرتے تھے۔ مٹی کی تختیوں پہ وہ یہ تحریریں لکھ لکھ رکھتے۔ اُن تحریروں سے ''یورپی'' زبانوں کی اساس اُٹھی۔ ساری یورپی زبانوں کی۔
ہماری ایشیا کی زبانوں کی ماں ''میسوپوٹیمیا'' تھی۔

''مٹی کی دیوی کے بت'' بہت بناتے۔ اُسی کی پوجا کرتے۔

اُس شہر میں عورت راج تھا۔

عورت ایک سے زیادہ مرد بھی ساتھ رکھتی۔ رکھ سکتی تھی۔

کھیل کود کے علاوہ وہ لوگ ''شطرنج'' جیسی بساط بھی بچھا کے کھیلتے تھے، بڑے بڑے سے سونا چاندی اور قیمتی پتھروں سے جڑے ہوئے لکڑی کے بورڈ پہ۔

کہنے کو وہ لوگ اور بھی میٹھے پھلوں کی شراب بناتے مگر انہیں ''انگور'' کی شراب بنانے کا زیادہ شوق تھا۔ اُن کے گھروں کی دیواروں پہ بنی تصویروں میں ''انگور'' سے شراب بنتی بنائی گئی۔ باقی تصویروں میں نیم عریاں لڑکیاں مٹی اور پیتل کے بنے ''جام'' میں شراب پلاتی دکھائی دیتی ہیں۔

وہ ہنستا بستا، ''یورپا'' ملکہ کا بسایا شہر اک خوفناک زلزلے سے کپکپا کے مٹی کا ڈھیر ہو گیا مگر آس پاس کے دوسرے شہروں میں اپنی تہذیب کے بیج بو گیا۔

وہ غلط ''رستے'' پہ تھا۔

مٹا دیا گیا۔

انہی مٹے ہوئے شہروں کو ہزاروں سال کی راکھ اُتار کے، غور سے دیکھ کے انہیں، سوچنے کا کہا گیا۔

سوچا تم نے؟

''پلوٹو'' سوچتا تھا۔

''پلاٹو'' جس کا نام ہم اردو والوں نے خدا جانے کیوں بگاڑ کے ''افلاطون'' کر دیا۔ اُس نے اپنی کتاب ''یوٹوپیا'' میں جو جنت ارضی کا تصور لیا ہے، وہ اسی ''یورپا'' شہر کا تھا۔

''ہومر'' نے اپنی ''ایلیڈ'' میں جس ''سنہرے شہر'' کی بات کی وہ بھی یہی شہر تھا۔

اِسی کے رنگ میں شروع شروع کی ساری ''یونانی'' تہذیب رنگی گئی۔

وہی رنگ پورے یورپ اور مغربی دنیا نے خود پہ چڑھا لیا۔

اب سمجھی؟

''قلوپطرہ'' ''یونان'' کی تم سے ساری باتیں سنتی۔

''پلاٹو'' کے گرو ''سقراط'' کی کہانی بھی، جسے شہر والوں نے سزا دی کہ زہر پیالہ پی لو۔

''قلوپطرہ'' اُس پیالے میں زہر تھوڑی تھا۔

زہر ہوتا تو ''سقراط'' مر گیا ہوتا۔

وہ تو صدیوں بعد بھی زندہ ہے۔

تم نے بھی تو خود کو کہنے کو پتلے سبز رنگے زہریلے سانپ سے ڈسوایا تھا، قلوپطرہ۔

یہ بات بھی جھوٹ لگتی۔

تو مر کے بھی نہیں مری،

دیکھ صدیوں بعد بھی تو میرے ساتھ بیٹھی ہے۔

تیری زندگی کا وہ دن کیسا تھا۔

جب تیرے محل پہ تیرے مخالف دشمن بھائی کی فوج نے پہرہ بٹھایا تھا، اُسی پہرے کو ''تاراج'' کرتے ہوئے، اُس عہد میں ''روم'' کا سب سے بڑا جرنل، چھپن سالہ ''جولی سیزر'' تمہارے محل پہ آ قابض ہوا تھا۔

تیرا مخالف بھائی اُس کے سامنے اپنی حاکمیت کی دلیل دیتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ''روم'' کی طرف سے اُسے ''مصر'' کا ''بادشاہ'' مان لیا جائے اور تمہیں حکومت سے بے دخل کرنے کا حکم جاری ہو۔

اُس لمحے تم نے کمال کا جادو دیکھایا۔

ایسی بہادری اور شوخی تاریخ میں نہ پہلی کسی نے دیکھی نہ بعد میں کسی نے دکھائی۔

یاد آیا، ''ملکہ قلوپطرہ''۔

دیکھ، جانتی تھی تم، اُس لمحے محل طرف کی ہر راہ تمہاری دشمن تھی۔ تمہارے مٹھی بھر ''وفادار'' دور سمندر میں کہیں چھپے ہوئے تھے۔ تمہاری عمر اُس وقت بیس سال تھی، قد تمہارا پانچ فٹ چھ انچ، کمر بس اتنی، دیکھ ادھر، یوں دو ہاتھوں سے پکڑوں تو ساری ہاتھوں میں سما جائے۔

ہے نا؟

ہنس کیوں رہی ہو۔

سچ میں، اُس وقت تمہارا وزن بہت کم تھا۔ پتلی سی تم تھی۔ سر سے پاؤں تک لیکن پوری آفت تھی۔

بجلی تھی تم میں۔ انگ انگ میں بھری تھی۔

اصل ''کرنٹ'' تو تیرے دیکھنے میں۔

توبہ۔ اتنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، آنکھوں کا لمبا کاجل، انہونا جادو بھرا، ساحرانہ لمبی پلکیں تمہاری تھرتھراتیں تو دیکھنے والوں کے پیروں نیچے سے زمین ہلنے لگتی۔ تمہاری آنکھوں کو دیکھ کے لگتا ناگن اپنا پھن کھولے سامنے اٹھی وجد میں سرسرا رہی ہے۔ عجیب پُراسراریت ہے تمہاری آنکھوں میں۔ پپوٹوں پہ نیلا رنگ ساتھ گہرے سیاہ کاجل کی تلواریں اوپر تمہارے کالے سیاہ لمبے ملائم ریشم کے تھان۔

تم ''آئی سِس'' دیوی کا اونچا بھاری عقاب کی چونچ اور کوبرا کے کھلے پھن والا سونے کا تاج پہنے اپنے دربار میں ہوتی تو کون تمہیں آنکھ اٹھا کے دیکھ سکتا، گستاخ۔ مگر یہ بات ہے اُن دنوں کی جب معاملہ اور تھا۔ بول نا، قلوپطرہ کھول اپنے ہونٹ۔ آرٹ گیلری سے اٹھا کے لائے ہوئے میٹھے ہونٹ۔ ہیرے کی کنی سے کٹے، لال سرخ میٹھے جوسی ہونٹ، جو ایک دوسرے کو یوں بے دھیانی میں کپکپا کے چومتے کہ دیکھنے والا گرتے گرتے بچتا۔ جو دیکھے، وہ سوچے کہ ان ہونٹوں کو چوس کے شہد سے اک پیالہ بھر جائے۔

ایسی مٹھاس تھی تیرے رُخ پہ۔

ہے نا، بول ''قلوپطرہ''

گورا رنگ

انگ انگ میں ترنگ۔

اس حال میں تم نے وہ تماشا کیا۔

جو دنیا کی تاریخ میں انہونا۔

یاد آیا؟

محل کے اندر ''جولی سیزر'' تک جانے کی کوئی راہ نہ بچی تھی۔ تم ایک چھوٹی سی کشتی سے محل کے قریب کنارے پہ آئی۔

اُتری۔

تمہارے ساتھ صرف ایک وفادار تھا۔

☆☆☆☆☆

میر کی متنازع غزل، تحقیق کے تناظر میں

کسی گمنام یا کم معروف شاعر کا کوئی اچھا شعر کسی نامور شاعر سے منسوب ہو جانا کوئی نئی بات نہیں۔ بعض اشعار تو اتنے تیز قدم نکلے کہ اپنے خالق کو رستے ہی میں چھوڑ گئے اور وہ غبارِ راہ میں گم ہو کر رہ گیا۔ اس بارے میں زیادہ مثالیں درج کرنا یہاں مناسب نہیں کہ میرا اصل موضوع کچھ اور ہے۔ سیماب اکبر آبادی کا ایک شعر ہے:

عمرِ دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

.....

یہ شعر، باوجود اس کے کہ ان کے مجموعۂ کلام میں بھی درج ہے اور رسائل میں بھی شائع ہو چکا ہے لیکن اسے بہادر شاہ ظفر سے منسوب کر دیا گیا اور ظلم تو یہ کہ ان کے دیوان (جو قیام پاکستان کے بعد شائع ہوئے) میں بھی شامل ہو گیا۔ اسی طرح صادق حسین صادق (شوکت کاظمی کے والد) کا درج ذیل شعر اقبال سے منسوب ہو گیا:

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب!
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

.....

کئی اشعار جو میر کے نہیں مگر ان سے منسوب کر دیے گئے ہیں، میرا موضوع بھی میر سے منسوب ایک غزل ہے:

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد
منہ پہ رکھ دامنِ گل روئیں گے مرغانِ چمن
ہر روشِ خاک اڑائے گی صبا میرے بعد
اب تو ہنس ہنس کے لگاتا ہے وہ مہندی لیکن
خوں رلاوے گا اسے رنگِ حنا میرے بعد
چاک کرتا ہوں اسی غم سے گریبانِ کفن
کون کھولے گا ترے بندِ قبا میرے بعد
وہ ہوا خواہِ چمن ہوں کہ چمن میں ہر صبح
پہلے میں جاتا تھا اور بادِ صبا میرے بعد
تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

خورشید ربانی

کیا عجب مرقدِ لیلیٰ سے جو نکلے یہ صدا
میرے مجنوں تیرا کیا حال ہوا میرے بعد
بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میر
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

....

مذکورہ بالا غزل میر کے کلیات میں ہے نہ ہی اور کوئی مستند حوالہ دستیاب ہے جس سے اسے میر کی غزل تسلیم کیا جائے۔ جو اصحاب اسے میر کی غزل بتاتے ہیں وہ اپنے دعویٰ کی بنیاد ''بحرالفصاحت'' (۱) کو بتاتے ہیں جس میں یہ غزل میر کے نام سے درج ہے۔ حکیم نجم الغنی نجمی رام پوری کی یہ کتاب پہلی بار (1885) میں شائع ہوئی تھی، انھوں نے اسے میر کے نام سے کتاب میں شامل کیا لیکن تدوین کار ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے حواشی میں لکھا کہ'' یہ غزل خدائے سخن میر تقی میر کے کسی دیوان میں نہیں ہے۔ مصحفی کے تذکرے ''ریاض الفصحا'' میں یہ محمد تقی خاں ہوس کے ترجمے میں، اُن کے کلام کے نمونے کے طور پر درج ہے۔'' (۲)۔ میں نے '' ریاض الفصحا'' کو دیکھا تو وہاں ہوس کی غزل موجود ہے مگر اُس میں مذکورہ بالا غزل کے صرف دو شعر شامل ہیں اور باقی اشعار کچھ اور ہیں۔ یعنی یہ حوالہ بھی درست نہیں کہ یہ غزل ریاض الفصحا میں درج ہے۔ دوسری دلیل امانت لکھنوی (اندرسبھا کے خالق) کی ایک مخمس کی دی جاتی ہے جو ان کے شعری مجموعہ ''گل دستۂ امانت'' میں درج ہے۔ امانت لکھنوی کی مخمس (موسوم بر غزلِ میر تقی صاحب تخلص میر) کا ایک بند ملاحظہ ہو:

میری وحشت کا جو کچھ حال ہوا میرے بعد
ہو گیا جوشِ جنوں حد سے سوا میرے بعد
سونا جنگل جو پڑا اس کو بلا میرے بعد
آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد
(۳)

ان مندرجات کو بنیاد بنا کر مظفر علی سید نے 'ماہِ نو' مئی 1952 میں ایک مقالہ لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ غزل میر کی ہے۔ مظفر علی سید نے اس غزل کے دیوانِ غافل میں شامل ہونے کو بھی یہ کہہ کر رد کر دیا کہ چونکہ ان کا دیوان، ان کی وفات کے بعد ''کار پردازان مطبع نے جمع کر کے'' شائع کیا ہے لہٰذا دوسرے شعرا کا کلام بھی غلطی سے شامل کر لیا گیا۔ مظفر علی سید نے یہ بھی لکھا غزل کا مزاج بتا رہا ہے یہ میر کی ہے اور یہ کہ منور خان غافل کا بقیہ کلام شاہد ہے کہ وہ ایسا شعر نہیں کہہ سکتے تھے۔ ماہ نو جنوری 1953 کے شمارے، (بعد ازاں اپنی کتاب تحقیقی مطالعے) میں جواب آں غزل کے طور پر عطا کاکوی (سید عطاالرحمٰن شاہ) کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں انھوں نے دلائل کے ساتھ مظفر علی سید کے مذکورہ دعویٰ کو رد کر دیا۔ عطا کاکوی امانت

لکھنوی کی مخمس بر غزل میر تقی سے متعلق لکھتے ہیں ''میاں امانت یا کاتب کے خیال میں شخصیت تو مرزا تقی کی تھی لیکن تحت الشعور میں میر ہی بسے ہوئے تھے۔ اس لیے عنوان تو رکھا مخمس موسوم بر غزل تقی صاحب مگر مقطعے میں میر داخل ہو گئے۔ لفظ صاحب دلالت کر رہا ہے کہ امانت کے ذہن میں تقی ہوس تھے جو اس وقت زندہ تھے''۔(۴)

کسی کے رنگ میں شعر کہنا ممنوع نہیں، پھر اپنے سینئر اور مقبول شاعر کو نئے لکھنے والے کاپی بھی کرتے ہیں، جیسا کہ آج کل ہر نیا لکھنے والا جون ایلیا بننے کی کوشش کرتا پھرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غزل اتنی مہربان صنف ہے کہ اچھا شعر کوئی بھی کہہ سکتا ہے۔ اُس زمانے میں کہ جب میر کا شہرہ تھا، کئی شعرا اُن سے متاثر ہوئے اور اُن کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ مرزا محمد تقی ہوس، مصحفی کے شاگرد اور میر کے ہم عصر تھے۔ ان کی شاعری سے متعلق نیاز فتح پوری لکھتے ہیں ''اُن کے کلام میں بالکل میر کا لطف آتا ہے''(۵)۔ ہوس نے میر کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے، اِس کی زندہ مثال ان کا یہی شعر ہے جو بہت معروف ہوا، اور اب تو ضرب المثل بن چکا ہے:

تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

مظفر علی سید اور عطا کاکوی کی آرا اپنی جگہ، حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ غزل میر، غافل، اشرف علی خاں (خان دہلوی) اور ہوش کے نام سے شعری انتخاب کے کئی مجموعوں میں شامل ہے۔ دو شعر مرزا تقی ہوس کے بھی اس غزل کا حصہ بنے ہیں۔ پہلے مرزا محمد تقی ہوس کی غزل دیکھیے، جو اُن کے مرتب کردہ قلمی نسخوں میں شامل ہے اور اسے مصحفی نے اپنے تذکرہ ''ریاض الفصحا'' میں بھی نقل کیا ہے:

بے کسی ہی نے نہ دنیا کو تجا میرے بعد
غم بھی مرقد پہ مرے بیٹھ رہا میرے بعد
تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد
اپنے مرنے کا مجھے غم نہیں، پر یہ غم ہے
کون ہوگا ہدفِ تیرِ بلا میرے بعد
کیا عجب مرقدِ لیلیٰ سے جو نکلے یہ صدا
میرے مجنوں ترا کیا حال ہوا میرے بعد
میں تو زنداں ہی میں دی جان، بلا سے میری
باغ عالم میں رہی گو کہ فضا میرے بعد
جیتے جی قدر بشر کی نہیں ہوتی پیارے
یاد آئے گی تمھیں میری وفا میرے بعد
اب تو کرتے ہو بہت لطف و کرم تم لیکن
بھول جانا نہ مجھے بہرِ خدا میرے بعد
اٹھ گیا میں جو جہانِ گزراں سے تو ہوس
خاک چھانے گی بہت بادِ صبا میرے بعد
(۶)

سعادت خان ناصر نے اپنے تذکرہ ''خوش معرکہ زیبا'' میں ہوس کی اس غزل کے تین شعر دیے ہیں اور ایک مصرع یوں نقل کیا ہے:

شاید آ نکلے کوئی آبلہ پا میرے بعد (۷)

....

مرزا تقی ہوس کے مندرجہ بالا اشعار کے استناد کے لیے یہی کافی ہے کہ انھیں مصحفی نے اپنے تذکرہ میں درج کیا۔ مصحفی نے 1806 تا 1821 کے دوران تذکرہ ''ریاض الفصحا'' مرتب کیا تھا اور انھوں نے ہوس کے حوالے سے لکھا کہ اُن کا دیوان تیار ہو چکا ہے۔ سید سلیمان حسین نے ''انتخابِ ہوس'' (۸) کے لیے، اُن کے ایک قلمی دیوان سے مدد لی۔ افسر صدیقی امروہی نے تلامذۂ مصحفی کی تیاری میں بھی ہوس کے قلمی دیوان سے ان کے پانچ شعر درج کیے ہیں، جن میں اس غزل کا مطلع شامل نہیں۔ ہوس پر پی ایچ ڈی کی سند لینے والے آغا حیدر حسن عابدی لکھتے ہیں کہ ''ہوس کے اردو، فارسی کلام اور انتخاب کے چندرہ قلمی دیوان دریافت ہوئے جو ہندوستان کے شہروں بھوپال، لکھنو، رام پور، علی گڑھ اور حیدر آباد میں موجود ہیں'' (۹)۔ انھوں نے بھی اپنے تحقیقی مقالے میں ہوس کی اس غزل کے پانچ شعر شامل کیے ہیں۔

مرزا تقی ہوس نے قلمی دیوان میں اپنی طرح غزلوں کی نشان دہی کی ہے مگر اس غزل کو شامل نہیں کیا، لگتا ہے یہ زمین انھی کی اختراع ہے۔ حالانکہ اس زمین میں مصحفی کی غزل بھی ہے جو ان کے دیوانِ پنجم میں شامل ہے۔ ان کی غزل سے دو شعر ملاحظہ کیجیے:

اے فلک رکھ نہ تو یہ بات روا میرے بعد
ہاتھ میں گل کے ہو دامانِ صبا میرے بعد
خون روتا ہوں میں اس غم سے کہ کیا جانے کون
تیرے پاؤں کو لگا دے گا حنا میرے بعد
(۱۰)

....

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ زمین مصحفی کی ہو اور ہوس، اشرف علی خان اور منور خان غافل نے شاگرد ہونے کے ناطے، استاد سے اظہارِ عقیدت یا اپنی طبیعت سے اس زمین میں شعر کہے ہوں۔ میر کی اس زمین میں تو غزل نہیں ہے لیکن اس ردیف میں ایک غزل موجود ہے۔ دو شعر ملاحظہ کیجیے:

آوے گی میری قبر سے آواز میرے بعد
ابھریں گے عشقِ دل سے ترے راز میرے بعد
بیٹھا ہوں میر مرنے کو اپنے میں مستعد
پیدا نہ ہوں گے مجھ سے بھی جانباز میرے بعد
(۱۱)

....

یہ بھی امکان ہے کہ مصحفی یا ہوس نے میر کی اس غزل سے تاثر لیا ہو اور قافیہ بدل کر غزلیں کہی ہوں۔ ہوس کے دو اور ہم عصر شاعروں کے ہاں بھی اس زمین میں غزلیں

ملتی ہیں، ان میں ایک تو نواب الٰہی بخش معروف ہیں، جن کا دیوان چھپ چکا ہے اور ان کا ذکر تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

باغِ ہستی میں کھلا گل یہ نیا میرے بعد
غیر سے وہ مرے پھولوں میں ملا میرے بعد
جو ہے سودائے معیشت میں ہے غلطاں معروف
عاشقی کا کہیں چرچا نہ رہا میرے بعد
(۱۲)

دوسرے شاعر نواب فقیر محمد خان گویا ہیں، وہ امرائے لکھنو میں سے تھے، اس زمین میں ایک طویل غزل ان کے دیوان میں بھی درج ہے، دو شعر دیکھیے:

کر دیا اس نے اسیروں کو رہا میرے بعد
طائرِ رنگِ حنا تک نہ رہا میرے بعد
تیرے آنے کی دعا مانگی ہے اول میں نے
ساقیا ہاتھ سبو کا بھی اٹھا میرے بعد
(۱۳)

.....

یوں یہ امکان بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ زمین معروف کی ہو کہ وہ ہوس سے عمر میں بڑے تھے۔ البتہ گویا کی زمین ہونے کا امکان کم ہے۔ اب یہ تو طے ہو چکا کہ میر کی مفروضہ غزل میں دو شعر ہوس کے شامل ہیں۔ اب دیگر اشعار کی بابت کچھ بات ہو جائے۔ اس غزل میں شامل پانچ اشعار کے خالق منور خان غافل ہیں۔ اُن کے مطبوعہ دیوان میں شامل غزل ملاحظہ ہو جس میں اٹھارہ اشعار ہیں:

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد
میان میں اس نے جو کی تیغ جفا میرے بعد
خوں گرفتہ کوئی کیا اور نہ تھا میرے بعد
دوستی کا بھی تجھے پاس نہ آیا ہے ہے
تو نے دشمن سے کیا میرا گلہ میرے بعد
گرم بازارِ الفت ہے مجھی سے ورنہ
کوئی لینے کا نہیں نامِ وفا میرے بعد
منہ پہ رکھ دامنِ گل روئیں گے مرغانِ چمن
باغ میں خاک اڑائے گی صبا میرے بعد
چاک اسی غم میں گریبان کیا ہے میں نے
کون کھولے گا ترے بندِ قبا میرے بعد
اب تو ہنس ہنس کے لگاتا ہے وہ مہندی لیکن
خوں رلائے گا اسے رنگِ حنا میرے بعد
میں تو گلزار سے دل تنگ چلا غنچہ روش
مجھ کو کیا پھر جو کوئی پھول کھلا میرے بعد
وہ ہوا خواہِ چمن ہوں کہ چمن میں ہر صبح
پہلے میں جاتا ہوں اور بادِ صبا میرے بعد
سن کے مرنے کی خبر یار مرے گھر آیا
یعنی مقبول ہوئی میری وفا میرے بعد
ذبح کر کے مجھے نادم یہ ہوا وہ قاتل
ہاتھ میں پھر کبھی خنجر نہ لیا میرے بعد
میری ہی زمزمہ سنجی سے چمن تھا آباد
کیا صیاد نے اک اک کو رہا میرے بعد
آ گیا پیچ میں اس زلف کی اک میں نادان
نہ ہوا کوئی گرفتارِ بلا میرے بعد
قتل تو کرتے ہو پر خوب ہی پچھتاؤ گے
مجھ سا ملنے کا نہیں اہلِ وفا میرے بعد

برگ گل لائی صبا قبر پہ میری نہ نسیم
پھر گئی ایسی زمانے کی ہوا میرے بعد
گر پڑے آنکھ سے اُس کے بھی یکا یک آنسو
ذکر محفل میں جو کچھ میرا ہوا میرے بعد
تہِ شمشیر یہی سوچ ہے مقتل میں مجھے
دیکھیے اب کسے لاتی ہے قضا میرے بعد
شرط یاری یہی ہوتی ہے کہ تو نے غافل
بھول کر بھی نہ مجھے یاد کیا میرے بعد
(۱۴)

.....

منور خان غافل کا یہ دیوان اُن کے بیٹے نے شائع کیا تھا جو منشی نول کشور کے مطبع میں ملازم تھے۔ اس ضمن میں افسر صدیقی امروہوی اپنی کتاب ''تلامذہ مصحفی'' میں رقم طراز ہیں ''غافل کی اولاد میں ایک لڑکے کا نام جھمو خان تھا۔ یہ صاحب کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے اور منشی نول کشور کے مطبع میں ملازم تھے۔ منشی صاحب موصوف نے انھی کی زبانی منور خان غافل کے حالات سنے تھے اور قلمی دیوان منگوا کر شائع کیا تھا'' (۱۵)۔ سو مظفر علی سید کا یہ قیاس بھی درست نہیں کہ غافل کے انتقال کے بعد چونکہ دوستوں نے اُن کا کلام شائع کیا، اس لیے میر کے مفروضہ اشعار بھی اس غزل کا حصہ بنا دیے گئے۔ اگر ایسا ہے تو پھر میر کے بیٹے یا شاگردوں نے کوئی اعتراض کیوں نہ کیا یا اپنا احتجاج ریکارڈ پر کیوں نہیں لائے کہ یہ اشعار تو مصحفی اپنے تذکرے میں درج کر چکے تھے۔ حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ یہ تذکرہ میر کی زندگی ہی میں مرتب ہو چکا تھا۔

اب رہ گیا ایک شعر یعنی مقطع، تو اس کے ضمن میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ جیسے یہ غزلیں معروف ہوئیں اور لوگوں نے ہر دو غزلوں سے اپنی پسند کے اشعار لے کر آگے بڑھا دیے اور انھیں میر سے منسوب کر دیا، یہی حال مقطع کا ہوا۔ عطا کاکوی نے لکھا ہے کہ ''میر'' کی جگہ ''شوخ'' کا لفظ ہوگا جسے مقطع بنانے کے لیے میر سے بدل لیا گیا۔ یعنی:

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ شوخ
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد
(۱۶)

.....

اگرچہ اس زمین میں محمد یار خان رند، آتش، غالب اور نجانے کس کس شاعر نے شعر کہے ہیں لیکن مجھے یہ مقطع کہیں نہیں ملا۔ البتہ میر تقی میر کے بیٹے میر کلو کے دیوان میں اس مضمون کا ایک شعر درج ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ شعر میر کلو (1783-1867) ہی کا ہے کہ جو عرش تخلص کرتے تھے۔ ان کے دیوان میں اس زمین میں دو غزلیں ہیں۔ ایک پندرہ اشعار کی اور دوسری دس کی۔ پہلی غزل میں درج ایک شعر یہی مقطع ہے:

زندگی بھر نہ ملا، قبر پر آیا آخر
کی مرے درد کی عیسیٰ نے دوا میرے بعد
(۱۷)

میر کے بیٹے میر کلو کے نام سے معروف تھے۔ نام کے ساتھ میر لکھنا ہی غالباً مذکورہ بالا شعر میں تحریف کا سبب بنا ہوگا۔ اب آتے ہیں، اشرف علی خاں، خان دہلوی کی طرف کہ یہ مفروضہ غزل بعض لوگوں نے ان سے منسوب کر رکھی ہے۔ پہلے ان سے منسوب اشعار دیکھیے جو شعری انتخاب ''مجمع الاشعار'' (۱۸) اور ''غزل اثاثہ'' (۱۹) میں شامل ہیں۔

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد
کیا عجب مرقدِ لیلیٰ سے جو نکلے یہ صدا
میرے مجنوں ترا کیا حال ہوا میرے بعد
تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد
وہ ہوا خواہ چمن ہوں کہ چمن میں ہر صبح
پہلے میں جاتا تھا اور بادِ صبا میرے بعد
منہ پہ رکھ دامنِ گل روئیں گے مُرغانِ چمن
ہر روش خاک اڑائے گی صبا میرے بعد
اس لیے کرتا ہوں میں چاک کفن کو اپنے
کون کھولے گا ترے بندِ قبا میرے بعد
جیتے جی قدر بشر کی نہیں ہوتی پیارے
یاد آئے گی تجھے میری وفا میرے بعد
دل پہ اک سانپ سا لہراتا ہے مرقد پہ صنم
کون کھولے گا تری زلفِ دوتا میرے بعد
جا کے کہہ دیوے کوئی خاں کی زبانی اتنا
اب نہیں آتے ہو پھر آؤ گے کیا میرے بعد

.....

ایک اور قدیم شعری انتخاب ''گل دستۂ حفیظ اللہ خان'' میں خان کے تخلص کے ساتھ زیر عنوان شامل غزل (۱۳۸) میں باقی اشعار تو یہی ہیں لیکن ایک شعر اضافی ہے:

لاش مجھ کشتۂ کاکل کی کوئی لنکا دو
تا نہ ہووے کوئی محبوسِ بلا میرے بعد
(۲۰)

.....

یہ وہ مآخذ ہیں، جن کی بنیاد پر عام شعری انتخابات میں یہ غزل اشرف علی خان سے بھی منسوب کر دی گئی ہے۔ ایسے شعری انتخاب صرف یادداشتوں کی بنیاد پر ترتیب دیے جاتے ہیں یا پھر پہلے سے موجود انتخاب اٹھا کر ان سے اشعار چن لیے جاتے ہیں۔ اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ آپ بازار میں دستیاب کسی بھی انتخاب کو دیکھ کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان میں قریباً سو فیصد ایک جیسے ہی اشعار درج ہوتے ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ کمرشل بنیادوں پر کیا جانے والا کام ''کاٹا اور لے دوڑی'' کے مصداق ہی سامنے آتا ہے اور قریباً ہر مرتب چند کتابیں اٹھاتا ہے اور اپنا انتخاب ترتیب دے دیتا ہے۔ اس کی تصدیق اس بات سے کی جا سکتی ہے کہ پہلے انتخابِ شعر میں جو شعر غلط درج ہوا یا کسی کا شعر کسی اور شاعر کے نام سے منسوب ہو گیا، باقی کے قریباً سبھی انتخاب اس غلطی کو دہراتے چلے گئے۔

اس غزل کے ضمن ہی میں دیکھ لیں کہ قریباً

ایک ہی زمانہ میں ایک ہی نام یعنی ''مجمع الاشعار'' سے موسوم کئی انتخاب شعر مختلف پبلیشرز نے چھاپے ہیں اور یہ ریختہ پر موجود ہیں، یہ سارے ایک دوسرے کی کاپی معلوم ہوتے ہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے ان میں سے کچھ انتخاب مطبع نول کشور سے شائع ہوئے لیکن کسی نے خیال نہ کیا کہ ایک ہی غزل کئی شاعروں کے نام سے چھپ رہی ہے۔ غافل کا دیوان بھی اسی مطبع سے شائع ہوا لیکن توجہ کسی نہ کی۔ اشرف علی خان کا کلام ''دفترِ گلزار'' (قلمی نسخہ) اور ''خان سامان'' (قلمی نسخہ) کے نام سے جمع کیا گیا تھا۔ یہ قلمی نسخے رضا لائبریری رام پور میں محفوظ بتائے جاتے ہیں۔ ان کے قلمی دیوان کے حوالے کے ساتھ اُن کا جو منتخب کلام مختلف تذکروں میں شامل ہے، اس میں اس زمین میں لکھی گئی ان کی غزل کے یہ اشعار درج ہیں۔ لالہ سری رام نے اپنے تذکرہ ''خم خانۂ جاوید'' جلد سوم میں اشرف علی خان کے تین شعر اس غزل سے درج کیے ہیں:

رہی کچھ تھوڑی سی وحشت کی ہوا میرے بعد
پہلے میں وحشی ہوا قیس ہوا میرے بعد
تو ابھی سے تو نہ اُس بت کی طرف داری کر
مجھ سے ہو جائیو اے دل تو جدا میرے بعد
اس برائی کے سزاوار ہمیں ہیں پیارے
گالیاں کس کو سناؤ گے بھلا میرے بعد
(۲۱)

.....

افسر صدیقی امروہی نے اپنی کتاب ''تلامذہء مصحفی'' میں اشرف علی خان کے دو شعر نقل کیے ہیں۔ ایک شعر تو وہی ہے جو اوپر کے اشعار میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے ان کا مقطع درج کیا ہے:

جا کے کہہ دیوے کوئی خاں کی زبانی اتنا
اب نہیں آتے ہو، پھر آؤ گے کیا میرے بعد
(۲۲)

.....

یہ دونوں حوالے اس لیے اہم ہیں کہ ان اصحاب نے اشرف علی خان کے قلمی دیوان سے یہ اشعار نقل کیے ہیں، جو سٹیٹ لائبریری حیدر آباد بھارت اور رضا لائبریری رام پور میں موجود ہیں۔ ان حوالوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اشرف علی خان سے منسوب اس غزل میں مقطع کے سوا دو شعر ہوس کے اور باقی غافل کے ہیں۔ میر اور اشرف علی خان سے منسوب یہ غزل ایک اور قدیم شعری انتخاب ''نغمۂ دلکش'' میں ہوش کے نام سے درج ہے۔ جس میں شامل چار اشعار ہوس کے ہیں اور باقی پانچ غافل کے۔ مقطع ہوس کا ہے جس میں معمولی تبدیلی کی گئی ہے:

اس جہاں سے جو میں اٹھ جاؤں گا افسوس لے ہوشؔ
خاک چھانے گی بہت بادِ صبا میرے بعد
(۲۳)

.....

میں نے ہوش تخلص رکھنے والے قریباً تمام شعرا کا کلام تلاش کرنے کی حتی المقدور

کوشش کی مگر صرف حکیم نیاز احمد ہوش کا دیوان مل سکا ہے اور اس میں یہ غزل تو کجا اس زمین میں بھی غزل موجود نہیں۔ دوسرا لگتا یہی ہے کہ یہ انتخاب بھی صرف یادداشت کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے کیوں کہ اس انتخاب میں شامل ہر غزل مقطع کی بنیاد پر شاعر سے منسوب ہے یعنی غالب نے کہیں اسد تخلص کیا اور کہیں غالب تو یہاں یہی درج ہے کہ غزلِ اسد، غزلِ غالب۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مرتب نے کس قدر محنت کی ہوگی۔ اس مضمون کا مقصد ان خوب صورت اشعار کے حقیقی تخلیق کار کو تلاش کرنا اور ادب کے قارئین سے متعارف کرانا تھا۔ مجھے خوشی ہو گی اگر میری اس کوشش سے ان اشعار کے حقیقی لکھنے والوں کا نام زندہ ہو سکے یا اس ضمن میں مزید کوئی تحقیقی کام سامنے آئے جو حقائق سے پردہ اٹھا دے۔ تب تک ہمیں مذکورہ بالا شواہد کی روشنی میں ان اشعار کو اس تحریر میں مذکور شعرا کے نام ہی سے لکھنا اور پڑھنا ہوگا۔

حوالہ جات

۱۔ نجم الغنی، حکیم، بحر الفصاحت، جلد اول، تدوین، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۶) ص ۷۷

۲۔ ایضاً ص ۱۵۲

۳۔ امانت لکھنوی، گل دستہ امانت، (منشی نول کشور، ۱۸۸۷) ص ۷۰۸

۴۔ عطا کاکوی، تحقیقی مطالعے، (عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ، ۱۳۹۵) ص ۱۲۵

۵۔ نیاز فتح پوری، ماہ نامہ نگار، سالنامہ ۱۹۹۵ شمارہ ۱۲، (انتقادیات نمبر)، نگار اکیڈمی لکھنو، ۱۹۵۴ ص ۴۷

۶۔ مصحفی، غلام مصطفیٰ ہمدانی، ریاض الفصحا، (انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن، بھارت، ۱۹۳۴) ص ۳۶۷، ۳۶۸

۷۔ سعادت خان ناصر، خوش معرکہ زیبا، (نسیم بک ڈپو لکھنو، ۱۹۷۱) ص ۳۶۳

۸۔ سلیمان حسین، سید، مرتب، انتخاب ہوس، (اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، ۱۹۳۸) ص ۳۴

۹۔ عابدی، حیدر حسن، آغا، ہوس، شخصیت و فن، (تفسا کمپیوٹر، پرنٹرز اینڈ پبلیشرز مراوتی کیمپ، مہاراشٹر، ۲۰۰۲) ص ۶

۱۰۔ مصحفی، غلام مصطفیٰ ہمدانی، کلیاتِ مصحفی، جلد پنجم، (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۶) ص ۱۲۳

۱۱۔ میر، محمد تقی، کلیات میر، (منشی نول کشور لکھنو، ۱۹۴۱) ص ۶۲

۱۲۔ صدیقی، عتیق احمد، مرتب، انتخاب کلام الٰہی بخش معروف، (اتر پردیش اکادمی لکھنو ۱۹۹۱) ص ۹۴

۱۳۔ گویا، فقیر محمد، دیوانِ گویا، (مطبع نظامی کانپور، ۱۲۸۲ھ) ص ۵۷، ۷۶

۱۴۔ غافل، منور خان، دیوانِ غافل، (منشی نول کشور، پریس لکھنو، ۱۸۷۲) ص ۲۵، ۲۶

۱۵۔ افسر صدیقی امروہوی، تلامذہ مصحفی، (مکتبہ نیا دور کراچی، ۱۹۷۹) ص ۲۳۹

۱۶۔ عطا کاکوی، تحقیقی مطالعے، (عظیم الشان

بک ڈپو پٹنہ، ۱۹۵۶) ص ۱۲۴

۱۷۔ عرش، میر کلو حسن عسکری، دیوانِ عرش، جلد دوم، (مکتبہ کارخانہ لکھنؤ، ۱۸۷۵) ص ۳۷

۱۸۔ نادر حسین خان، مرتب، مجمع الاشعار، (مطبع فیض لکھنؤ، ۱۸۷۸) ص ۳۸، ۳۹

۱۹۔ محبوب ظفر، مرتب، غزل اثاثہ ۲۰۱۶، (نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۶) تاریخ ۲۱ مئی

۲۰۔ مولوی حفیظ اللہ، مرتب، گل دستہ حفیظ اللہ خان، (منشی نول کشور لکھنؤ، ۱۸۲۸) ص ۵۸

۲۱۔ لالہ سری رام، خم خانہ جاوید، جلد سوم، (دلی پرنٹنگ پریس، دہلی بھارت س ن) ص ۹

۲۲۔ امروہی، افسر صدیقی، تلامذہ مصحفی، (مکتبہ نیا دور کراچی، ۱۹۷۹) ص ۱۰۷

۲۳۔ مکھن لعل، نغمہ دل کش، جلد سوم، (مطبع شوکت الاسلام لکھنؤ، سن ندارد) ص ۳۶

کتابیات

ز۔ امانت لکھنوی، گل دستہ امانت، منشی نول کشور، ۱۸۸۱ء

ز۔ امروہی، افسر صدیقی، تلامذہ مصحفی، مکتبہ نیا دور کراچی، ۱۹۷۹

ز۔ حفیظ اللہ، مولوی، مرتب، گل دستہ حفیظ اللہ خان، منشی نول کشور لکھنؤ، ۱۸۸۲

ز۔ سعادت خان ناصر، خوش معرکہ زیبا، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۷۱

ز۔ سلیمان حسین، سید، مرتب، انتخاب ہوس، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۲

ز۔ صدیقی، عتیق احمد، مرتب، انتخاب کلام الٰہی بخش معروف، اتر پردیش اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۱

ز۔ عابدی، حیدر حسن، آغا ہوس، شخصیت و فن، تقسا کمپیوٹر، پرنٹرز اینڈ پبلشرز مرادوتی کیمپ، مہاراشٹر، ۲۰۰۲

ز۔ عطا کاکوی، تحقیقی مطالعے، عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ، ۱۹۶۵

ز۔ عرش، میر کلو حسن عسکری، دیوانِ عرش، جلد دوم، مکتبہ کارخانہ لکھنؤ، ۱۸۷۵

ز۔ غافل، منور خان، دیوانِ غافل، منشی نول کشور، پریس لکھنؤ، ۱۸۷۲

ز۔ گویا، فقیر محمد، دیوانِ گویا، مطبع نظامی کانپور، ۱۲۸۲ھ

ز۔ لالہ سری رام، خم خانہ جاوید، جلد سوم، دلی پرنٹنگ پریس، دہلی بھارت،

ز۔ محبوب ظفر، مرتب، غزل اثاثہ ۲۰۱۶، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۶

ز۔ مصحفی، غلام مصطفیٰ ہمدانی، ریاض الفصحا، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن، بھارت، ۱۹۳۴

ز۔ مکھن لعل، نغمہ دل کش، جلد سوم، مطبع شوکت الاسلام لکھنؤ، سن ندارد

ز۔ میر، محمد تقی، کلیات میر، منشی نول کشور لکھنؤ، ۱۹۴۱

ز۔ نادر حسین خان، مرتب، مجمع الاشعار، مطبع فیض لکھنؤ، ۱۸۷۸

ز۔ نجم الغنی، حکیم، بحر الفصاحت، جلد اول، تدوین، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۶

ز۔ نگار، سالنامہ ۱۹۹۵ شمارہ ۱۲، (انتقادیات نمبر) مدیر فرمان فتح پوری، نگار اکیڈمی لکھنؤ، ۱۹۴۵

☆☆☆☆☆

جمشید دُکھی ___ اے دوست! کہاں نکل گئے ہو

جمشید دکھی بھی آخر اس دارفانی میں زندگی کا عرصہ گزار کر عدم کو سدھار گئے۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔ ہر چیز نے آخر موت سے ہمکنار ہونا ہے۔ بعض لوگوں کا اچانک درمیان سے اُٹھ جانا یقیناً بے حد تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جمشید دکھی میرے ان چند خاص دوستوں میں سے ایک تھے جو ہر وقت میرے دل میں بستے تھے۔ ان سے باقاعدہ سے فون پہ بات ہوتی رہتی تھی۔ عموماً وہی فون کرتے اور میرے فون نہ کرنے پر ناراضی کا اظہار بھی کرتے، میں معذرت کر لیتا۔ ان کی کال تین چار منٹ سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ خیریت پوچھتے اور ہنستے ہوئے فون بند کر دیتے۔ ان سے بات کر کے کئی دن میں شاد مان رہتا تھا۔

مجھے ان کی جان لیوا بیماری کا علم نہیں تھا۔ ایک دن ایک دوست نے بتایا کہ جمشید دکھی بہت علیل ہیں، ان کو جگر کا سرطان ہو گیا ہے۔ مجھے سخت تشویش لاحق ہوئی، ان کو فون کیا تو ان کے بیٹے نے بتایا کہ ''وہ بہت بیمار ہیں'' بات نہیں کر سکتے، کسی وقت خود رابطہ کریں گے۔'' دل بجھ کے رہ گیا۔ بات کرنے کے لیے روزانہ ان کے سیل فون پر کال کرتا۔ ایک روز ان کا فون آ گیا کہنے لگے۔ 'اب بہتر ہوں میرے لیے دعا کریں۔'' پھر اچانک بولے یار! بیماری تو کوئی بھی لگ سکتی ہے۔ دنیا میں کون ہمیشہ رہنے کے لیے آیا ہے، سب نے چلے جانا ہے، بس کچھ عرصہ ہوا میری نیند بالکل ختم ہو گئی تھی۔'' دل بھر آیا۔ یہ ان سے آخری گفتگو تھی۔ کیا پتا تھا کہ اب کسی بھی وقت ان کی موت کی خبر آ جائے گی۔

20 فروری کا دن تھا، میں شب کو سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ ان کے جانے کی اطلاع آ گئی، تمام رات جاگتا رہا۔ آنکھوں کے پار یادوں کی ایک فلم چلنے لگی۔

جمشید دکھی ایک انوکھے شخص تھے۔ دکھی تخلص، دکھوں سے سُتا ہوا چہرہ، بے قرار آنکھیں، لیکن چہرے پر شگفتگی سجائے رکھتے، شیو عموماً حد سے بڑھی رہتی۔ سر کے بال بے ترتیب اور الجھے

ہارون الرشید

ہوئے۔ دوستوں کی محفل میں جب بھی کرسی پر براجمان ہوتے تو ٹانگ کے اوپر ٹانگ رکھ کر بیٹھتے۔ نظر عقابی تھی۔ دیر تک آسمان کی طرف نگاہ کیے رکھتے۔ محفل میں کبھی کسی موضوع پر بات کرتے تو بڑی تیزی سے آستینیں چڑھا لیتے۔ کسی شعر پر بحث کرتے تو سگریٹ کی ڈبیا جو ان کی قمیض کی دائیں جیب میں ہوتی تھی باہر نکل آتی۔ سگریٹ منہ میں دباتے ہی ماچس کی آواز لگانا شروع کر دیتے۔ سگریٹ کو دیا سلائی کا شعلہ دکھاتے تو پھر لمبے لمبے کش لگاتے۔ تین چار سوٹے لگاتے ہی سگریٹ دم توڑ دیتا تو اسے پاؤں تلے مسل دیتے۔ عموماً شام کے وقت زیادہ سگریٹ نوشی کرتے۔ میں اکثر ان سے مذاق میں کہتا۔ ”آپ سگریٹ پیتے کم اور کھاتے زیادہ ہیں۔ اس بات پر مسکراتے، کہتے اچھا!“ بڑے طنطنے سے گفتگو کرتے۔ باتیں کرتے ہوئے ان کے کان سرخ ہو جاتے۔ غصے میں بولتے تو ایسا لگتا جیسے کسی کو ڈانٹ رہے ہوں۔

جمشید دکھی کے پاس ایک پرانی موٹر سائیکل تھی جس پر وہ سارا دن شہر میں گھومتے رہتے تھے۔ مجھے بھی کئی بار ان کے ساتھ بیٹھنے کا موقع میسر آیا۔ موٹر سائیکل بہت تیز چلاتے تھے۔ ڈر لگتا رہتا تھا لیکن کبھی کوئی ناخوشگوار صورتحال پیدا نہیں ہوئی۔ ان کی موٹر سائیکل کی ہیئت کذائی دیکھ کر ایک ستم ظریف شاعر دوست اسے جنازہ کہتے تھے۔ وہ محکمہ جنگلات میں اکاؤنٹینٹ تھے۔ سیاسی لوگوں کے محلے میں مقیم تھے لیکن اپنی شاعرانہ حیثیت پر فخر کرتے تھے۔ انھیں گلگت بلتستان کا حبیب جالب کہا جاتا تھا۔ انہی کے انداز میں عوامی اشعار کہتے۔ لوگ ان کی شاعری کو بہت پسند کرتے تھے۔ کوئی مشاعرہ ہو وہ چھا جاتے تھے۔ علاقے کے عوام کے آلام اور ان کے ساتھ اہل اقتدار کی طرف سے روا رکھی جانے والی زیادتیوں اور چیرہ دستیوں کو نہایت عمدگی سے اپنے اشعار میں سمو دیتے تھے۔ اپنی سرزمین کے لیے یقیناً وہ ناگزیر تھے۔

مہمان نواز اتنے تھے کہ بیس دوست بھی ان کے دروازے پر آ جاتے تو پیشانی پر کوئی شکن لائے بغیر سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے پھٹ پھٹی موٹر سائیکل پر سامان تواضع لانے کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ ادبی دوستوں کے لیے ہمیشہ دیدہ و دل فرش راہ کیے رکھتے۔ حلقے کے احباب کے لیے سب کچھ کرنے پر تیار رہتے۔ گرمیوں کے موسم میں انھیں کارگاہ اور خلتر جیسے خوبصورت اور پرفضا مقامات پر لے جاتے اور تمام انتظامات کی خود نگرانی کرتے۔ کہیں جانے کی خبر اس وقت ملی جب وہ گاڑی لے کر دوستوں کے گھر پہنچ جاتے۔ میرے ہاں آتے تو باہر سے زور کی آواز لگاتے۔ یار! جلدی چلو، یہ بھی کوئی سونے کا وقت۔“ بھاگم بھاگ کپڑے تبدیل کر کے ان کے ساتھ نکل کھڑا ہوتا۔ سیر و تفریح کے دوران اتنی خدمت کرتے وہ سب کچھ ان پر نثار کرنے کو جی چاہتا۔ وہ اتنے ہمدرد اور مخلص دوست تھے کہ سخت سردی کے دن ہوں یا بارش برس رہی ہو شام سے پہلے حلقے کے تمام

دوستوں کو ان کے گھروں سے کھینچ کھانچ کے لے آتے اور انھیں ایک جگہ اکٹھا کر دیتے۔ شاید ہی کوئی ایسا دن ہوتا کہ ملنے نہ آتے۔ شعر وادب سے ان کی محبت اور کمٹمنٹ دیکھ کر اکثر لوگ ورطۂ حیرت میں پڑ جاتے۔ کوئی مشاعرہ ہوتا اس کے انتظامات اپنی نگرانی میں کرواتے اور کسی پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ مشاعرے کے دعوت نامے بھی دوستوں اور احباب کے گھروں میں خود پہنچاتے۔ اتنی انکساری اور بڑا پن کم کم لوگوں میں ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ زیادہ وقت دوستوں کے ساتھ گزارتے۔ اکثر رات گئے گھر جاتے۔ کھانا زیادہ نہیں کھاتے تھے لیکن بہت تیزی سے کھاتے تھے۔ دوستوں کے ہاں بڑی بے تکلفی سے حاضری دیتے۔ دعوتیں کھانے اور کھلانے کے بے حد شوقین تھے۔ کسی دعوت میں کھانے میں روسٹ نہ ہوتا تو میزبان دوست کو آڑے ہاتھ لیتے تھے۔ وہ ہمہ گری خوبیوں اور صفات کا ایک ایسا مجسمہ تھے جو کہیں بھی نصب کر دیا جائے تو لوگ اسے روز دیکھنے آئیں گے۔

حلقہ ارباب ذوق کا قیام 1987 میں ایجوکیشن کور سے تعلق رکھنے والے کبیر والا کے شاعر میجر قیصر فاروقی کی کینٹ ایریا گلگت کی رہائش گاہ پر عمل میں لایا گیا۔ انہی دنوں میں ان کی پوسٹنگ یہاں ہوئی تھی۔ اس موقع پر ان کے ہاں نامور ادیب اور محقق شیر باز علی برچہ اور جمشید دکھی بھی موجود تھے۔ میجر قیصر فاروقی نے اہل محفل کی درخواست پر مجھے حلقے کا جنرل سیکرٹری نامزد کیا۔ شاعر اور ادیب محمد امین ضیا اس کے صدر مقرر ہوئے۔ جمشید دکھی سے یوں تو تعارف پہلے سے تھا، لیکن بعد میں حلقے کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعروں اور ادبی تقاریب نے اس تعلق کو امر کر دیا۔

حسن شاد، محمد امین ضیا، ہدایت اللہ اختر، عبدالخالق تاج، خوشی محمد طارق اور اقبال عاصی جیسے خوبصورت شاعر میرے لیے نعمت مرقبہ ثابت ہوئے۔ ان احباب کی وجہ سے اور حلقہ ارباب ذوق کی سنجیدہ ادبی سرگرمیوں نے میرے ادبی سفر پر دوررس اثرات مرتب کیے۔ یہی وہ دن تھے جب ان سے دوستی گہرے تعلق میں تبدیل ہوئی۔ بعد ازاں ان سے گھریلو تعلقات بھی استوار ہوئے۔ انھوں نے گلگت میں قیام کے دوران میرا جس طرح خیال رکھا اور جو عزت اور احترام دیا، اسے میں تادم مرگ فراموش نہیں کر سکتا۔ 1992 میں میرے پہلے شعری مجموعے ''بوندیں'' کی اشاعت ہوئی تو اس کی پزیرائی میں وہ پیش پیش رہے۔ سیرینا لاج گلگت میں اس کی تقریب رونمائی ہوئی۔ کوآپریٹو بینک شمالی علاقہ جات کے جنرل منیجر شیر جہان میر اس کے مہمان خصوصی تھے۔ اس میں شہر کی تمام ادبی شخصیات کے علاوہ عمائدین شہر اور شائقین ادب کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض (مرحوم) حسن شاد نے سرانجام دیئے۔ ''بوندیں'' پر محمد امین ضیا، خوشی محمد طارق کے علاوہ

جمشید دکھی نے بھی نہایت وقیع اور علمی مقالہ پڑھا۔ تینوں مقالے آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے میری شاعری پر کچھ اور مضامین بھی تحریر کیے جو مختلف اخبارات میں اشاعت پزیر ہوئے۔

جمشید دکھی اور حلقہ کے دیگر دوستوں کے ہمراہ چترال کے مشہور سیاحتی مقام شیندور دو مرتبہ جانے کا موقع ملا۔ شیندور کا بہت لمبا اور تھکا دین والا سفر تھا اور بے حد دشوار گزار بھی۔ لیکن وہ زندگی کی یادگار یادوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس دوران ان کی دلکشی اور مہربان شخصیت کے کئی اور پہلو میرے سامنے آئے۔ جمشید دکھی اور دگر شاعر دوستوں کے ہمراہ بارہا گلگت کے گردونواح میں جانے کا موقع ملا۔ متعدد بار ان کے ہمراہ مشہور سیاحتی مقام خلتر کی سیر کی۔ آخری بار تلتر میں کوئی دو دن ہم نے قیام کیا۔ جمشید دکھی کے علاوہ خوشی محمد طارق اور اقبال عاصی بھی میرے ہمراہ تھے۔ گرمیوں کے دن تھے مگر رات کو وہاں اتنی سخت سردی تھی کہ ہم رات بھر آگ تاپتے رہے اور ایک دوسرے کو شعر سناتے رہے۔ ان سے اتنا گہرا انس تھا کہ روز ہم ملتے تھے۔ دریائے سندھ کے کنارے چنار باغ کے قریب ایک ہوٹل کے لان میں وہ اور دیگر حلقے کے دوست شام تک بیٹھے رہتے۔ شعر و ادب پہ گفتگو کرتے۔ خوشی محمد طارق، ہدایت اللہ اختر اور اقبال عاصی بھی اکثر وہاں موجود رہتے۔ چائے پیتے اور خوش گپیوں میں مصروف رہتے۔

جمشید دکھی گلگت بلتستان کے شینا اور اردو ادب میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ وہ مقامی بھاشا شینا اور اردو کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ محقق اور کالم نگار بھی تھے۔ وہ برسوں ایک مقامی اخبار میں باقاعدہ کالم لکھتے رہے۔ انھوں نے بے شمار اعلیٰ پائے کے کالم تحریر کیے۔ انھوں نے ادب کے علاوہ شمالی علاقوں کی سیاست، تہذیب اور مذہبی ہم آہنگی کو نہایت جرأت کے ساتھ اپنے کالموں کا موضوع بنایا۔ ان کے کالموں کو کتابی شکل دیا جانا چاہیے۔ انھوں نے شینا میں "پاکستان کا ثقافتی انسائیکلو پیڈیا" بھی مرتب کیا۔ معروف ادیب اور مؤرخ پروفیسر عثمان علی خان پر بھی انھوں نے ایک کتاب "پروفیسر عثمان علی خان ایک نامور مورخ" تحریر کی، جنھیں لوک ورثہ اسلام آباد نے شائع کیا۔ علاوہ ازیں حلقہ ارباب ذوق کے زیر گرانی "شمالی علاقوں کا اردو ادب (حصہ نظم)، مولانا راجی الرحمت (شخصیت اور فن) اور محمد حسن شاد (شخصیت اور فن) پر منظر عام آنے والی کتابوں کی ترتیب اور اشاعت میں مرکزی کردار ادا کیا۔

جمشید دکھی گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت کا تعین نہ ہونے پر بہت آزردہ تھے۔ وہ اس معاملے میں دیگر لوگوں کی طرح نہایت حساس تھے۔ پھر یہاں جب فرقہ واریت اور مذہبی منافرت حدوں کو چھونے لگی، تو انھوں نے مذہبی کشیدگی کو کم کرنے اور بین المذاہب ہم آہنگی کے لیے

بے مثالی کردار ادا کیا۔ ہر مکتبہ فکر ان کا احترام کرتا تھا۔ ان کی رائے اور تجاویز کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ نہایت اعلیٰ اور مثبت سوچ کے حامل دانشور بھی تھے انھوں نے اپنا ادبی قد بھی بلند کیا اور بحیثیت صاحب بصیرت عزت و رفعت بھی پائی۔ ایک مقامی ادیب محمد یونس سنوی ایک مضمون میں کہتے ہیں۔ ''جمشید دکھی یہاں کے ادبی حلقوں کی جان ہیں۔'' آپ ہمہ جہت شخصیت اور بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔'' انھوں نے سارے لوگوں کے دکھوں کو اپنی ذات کے حصار میں سمیٹ رکھا ہے۔ جب گلگت بلتستان فرقہ واریت کی سرخ آندھی کی زد میں آگئے تو ایسے میں جمشید دکھی جیسے اہل دل میدان میں اُترے۔ ان کے قلم سے نکلنے والے الفاظ نفرت کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ذہنوں کے لیے کشتی نوح کا کردار ادا کرنے لگے۔ فرقہ واریت کے شعلے جو آسماں کو چھو رہے تھے، بتدریج ان کی حدّت اور شدت میں کمی آنے لگی۔ علاقے میں امن کے قیام کے لیے جمشید دکھی اور ان کے رفقائے قلم کے ذریعے جو کام کیا ہے وہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔''

گلگت بلتستان ہمارے بے حد خوبصورت علاقوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہاں کے گلیشیئرز، فلک بوس پہاڑ، جنگلات، جھیلیں، آبشاریں اور دریا دنیا بھر میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ انھوں نے ان علاقوں کی محرومیوں اور ان کے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافیوں اور زیادتیوں کو بھی اپنی شاعری کا نہایت جرأت سے حصہ بنا دیا ہے:

مری دھرتی تو میری آبرو ہے
تری تصویر پیہم روبرو ہے
تری رعنائیوں اور خوشبوؤں میں
مرے اسلاف کا شامل لہو ہے
ہم سے بھی حال زار چمن پوچھیے
ہم بھی ہیں اہل دیس غریب الوطن نہیں
راز مجھ پر تب کھلا جب طے کیے سب فاصلے
اپنی کشتی کا سفر اک بے نشاں منزل میں ہے
میرا مسکن ہے برلب دریا
پھر بھی ہونٹوں پہ تشنگی ہے ابھی
میری بربادیوں میں روز شامل
تمھاری مہربانی دیکھتا ہوں
جب ہوئی آہ بے اثر میری
دست آمادۂ دعا نہ ہوا
میں اک پنچھی ہوں قیدی گلستاں میں
بناؤں اب کہاں پر آشیاں میں

.....

جمشید دکھی زیادہ غزل کہتے تھے۔ ان کی غزل روایت سے جڑی ہوئی ہے۔ ان کی غزلوں میں بعض مقامات پر فکر انگیز مضامین بھی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے مقامیت کا بھی اپنی غزلوں میں نہایت نفاست اور خوبصورتی سے استعمال کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ عصری مسائل کو بھی مہارت سے غزل میں سمویا جاسکتا ہے۔ انھوں نے چھوٹی اور مترنم بحروں میں نہایت اثر انگیز

شعر کہے ہیں، جنھیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ انھیں غزل کی حرمت کا کس قدر پاس تھا۔ ممتاز شاعر خوشی محمد طارق ان کے متعلق کہتے ہیں۔ ''ان کی غزلوں میں نغمگی، سلاست اور نیا پن نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری میں معاشرتی تضادات کی بھی واضح جھلک ملتی ہے وہ عام آدمی کے جذبات کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔''

ہوئی محوِ پرواز گردوں کی جانب
مری آہ میری نوا دھیرے دھیرے
پہلے سن ان کی زبانی پھر سنا
اے صبا! میری کہانی پھر سنا
ہم کو ہماری فرش نشینی عزیز ہے
اغیار صاحبِ مہ و افلاک ہو گئے
ہجر کے صدمے جو راس آئے مجھے
پھر بچھڑنے کا نہ کوئی غم رہا
موت سے آزادیوں کی ہے نمود
زندگی کو پابہ گل رکھا گیا
زمیں کی پستیوں میں بیٹھ کر میں
فلک کی راجدھانی دیکھتا ہوں

.....

گلگت سے مراجعت کو اب تیس برس ہونے کو آتے ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق نے مجھے نہایت مخلص اور دردمند دوست دیے اور انھوں نے مجھ پر اتنی محبتیں نچھاور کی ہیں کہ میں آج بھی ان کے آگے خود کو زیربار محسوس کرتا ہوں۔ جمشید دکھی نے تو اس ضمن میں حد کی۔ میرے بعد وہ حلقے کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے اور تادم مرگ اس عہدے پر فائز رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ دستار انہی کو سجتی تھی۔ اب ان کے جانے کے بعد وہاں رہا ہی کیا ہے۔ حلقہ کے صدر محمد امین ضیا نے سچ کہا ہے کہ ''جمشید دکھی کے مرنے کے بعد حلقہ یتیم ہو گیا ہے۔'' یتیم کیا ویران ہو گیا ہے۔ لیکن انسان کر بھی کیا سکتا ہے۔ جمشید دکھی کا جو کام تھا وہ انھوں نے کر لیا۔ طویل مدت ہوئی حلقے کے دوستوں سے پھر نہیں مل سکا۔ جمشید دکھی سے آخری ملاقات کوئی بارہ برس پہلے راولپنڈی میں ہوئی جب وہ مجھ سے ملنے آئے تھے اس کے بعد پھر ہم کبھی نہیں مل سکے۔ بس فون پر رابطہ رہتا تھا جو ان کی موت تک مسلسل جاری رہا۔ اس بات کا ہمیشہ رنج رہے گا کہ وہ مجھ سے ملے بغیر آخرت کی منازل کی طرف نکل گئے۔ موت سے چند دن پہلے راولپنڈی میں زیر علاج رہے لیکن مجھے تاخیر سے خبر ملی۔ ملنے کا پروگرام بنایا تو وہ گلگت جا چکے تھے۔ ایک دوست نے بتایا کہ وہ موت سے چند دن پہلے اپنی موٹر سائیکل پر شہر میں گھوم رہے تھے۔ ایسا انمول ہیرا جیسا جمشید دکھی اب کہاں ملے گا بس کبھی کبھار ٹوٹے ہوئے خوابوں میں:

اے دوست! کہاں نکل گئے ہو
تم رستہ بھی بدل گئے ہو
لگتا ہے زمانہ ہو گیا ہے
ویسے تو یہاں سے کل گئے ہو

☆☆☆☆☆

سوادِ سخن کا شاعر..... پروفیسر سحر انصاری

بیس ویں صدی کے آسمانِ ادب پر چمکنے والے تابندہ ستاروں کے مانند متعدد نام سامنے آئے جنھوں نے اُردو ادب کا دامن اپنی تخلیقاتِ نظم و نثر سے مالا مال کیا اور بعد ازاں اُن میں سے کچھ نام مہرِ منور کی طرح آج بھی جہانِ اُردو ادب میں روشنی پھیلا رہے ہیں۔ ابتدا میں کچھ ادبی شخصیات نے خود کو بہ حیثیت شاعر و نثر نگار پیش کیا مگر وقت اور قارئین کی مستند آرا نے اُن کے خیالات کو بدل ڈالا جس کی روشنی میں متعدد شاعروں نے شاعری کو ثانوی حیثیت دے کر تنقید اور دیگر نثری مضامین لکھنے شروع کیے تو اُن کے بروقت فیصلے کے سبب آج وہ بہ حیثیت نقاد اور نثّار ہمارے سامنے موجود ہیں اور اُن کے فن پارے اُردو ادب کا وقیع سرمایہ قرار پا گئے ہیں۔ کچھ شاعر خود آگاہی کے تحت ابتدا ہی سے شاعری کرتے رہے، آج وہ اپنے اُسلوب اور ندرتِ خیال کی بنیاد پر ''آبروئے غزل'' بن گئے ہیں۔ ایسی ادبی شخصیات بہت کم ہیں جنھوں نے شاعری کی اور نثر بھی لکھی اور وہ دونوں میدانوں میں یکساں مقبول ہوئے اور کام یاب بھی ٹھہرے۔

ایسے اہلِ قلم میں سب سے زیادہ معتبر اور سنجیدہ نام پروفیسر سحر انصاری کا ہے جو آج بہ حیثیت جدید شاعر تسلیم کیے گئے اور جید نقاد کے طور پر اپنے فن کا لوہا منوا چکے ہیں۔ وہ اُردو ادب کے منظر نامے پر مہرِ منور کی طرح جگمگا رہے ہیں، اُن کے علم و فن کی روشنی سے کائناتِ اُردو ادب میں اُجالا ہی اُجالا ہے۔ اُن کی ذہنی لیاقت، علمی استعداد، تعلیمی قابلیت اور خداداد صلاحیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے۔ میں نے تو اُن کے حریفوں کو بھی اُن کے علم و فن اور

شاعر علی شاعر

یادداشت کی تعریف کرتے سنا ہے۔

پروفیسر سحر انصاری پاکستان کے نمائندہ شاعر اور جید نقاد کی صورت میں ہمارے درمیان موجود ہیں۔ اُن کا شمار بیسویں صدی کے اُردو ادب کے اُن شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی شاعری کی بنیاد اپنے عہد کے مسائل و افکار پر رکھی۔ اُنھوں نے اپنے فکری و تخلیقی اظہار کا وسیلہ اپنے عہد اور اس کی روح کو بنایا ہے، گزشتہ ساٹھ برس سے اُن کا اوڑھنا بچھونا ادب رہا ہے اور اُنھوں نے شاعری اور تنقید خوب جم کر لکھی ہے۔ اُن کی زندگی میں فقط علم و فن ہی نظر آتا ہے۔

پروفیسر سحر انصاری نے اپنی شاعری دو کتابوں ''نمود'' اور ''خدا سے بات کرتے ہیں'' کی صورت میں اہالیانِ اُردو ادب کے سامنے پیش کی ہے۔ اُن کی تخلیقات شعری میں آفاقیت اِس لیے ہے کہ اُنھوں نے دنیا کی سب سے بڑی تخلیق ''انسان'' کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اُن کی شاعری میں تحرک اور حرکت و عمل اِس سبب سے ہے کہ اُنھوں نے اپنی شاعری میں انسانی زندگی، اس کے نشیب و فراز، تلخ و شیریں تجربات، عمیق مشاہدات، نازک احساسات اور شدید جذبات کو سمو دیا ہے۔ جس کی بنا پر ہم بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی شاعری زندہ رہ جانے والی شاعری ہے کیوں کہ اُن کے موضوعات بڑی شاعری سے تعلق رکھتے ہیں۔

پروفیسر سحر انصاری ایک وسیع المطالعہ شاعر ہیں۔ اُن میں ناقدانہ شعور بہ درجہ اتم ہے۔ اُردو شعری ادب میں شعرائے متقدمین، متوسطین، متاخرین سمیت عہدِ حاضر کے تازہ کار، نوآموز اور جدید شعرا بھی اُن کی نظر میں ہیں۔ ہر زمانے اور ہر زبان و ادب کا سرمایہ اُن کے مطالعے سے گزرا ہے۔ سب سے انفرادی بات یہ ہے کہ وہ نہ صرف اُردو ادب کے قاری ہیں بلکہ انگریزی، جرمنی، ہندی، عربی اور فارسی زبانوں کے ادب سے بھی آگاہی رکھتے ہیں اور اپنی شاعری کے ذریعے عہدِ حاضر اور دنیا کے اعلیٰ ادب کو اُردو میں ترجمہ کر کے اُردو ادب کے دامن کو وسعت دیتے رہے ہیں اور اسے دنیا کی دیگر زبان و ادب سے روشناس کراتے رہے ہیں۔

پروفیسر سحر انصاری زبان و بیان اور اُسلوب تازہ کے ساتھ فکر و مشاہدات، جذبات و احساسات پر مکمل دست رس رکھتے ہیں۔ وہ شعری آہنگ میں انفرادیت کے حامل ہیں۔ اُن کا مزاجِ شاعرانہ ترقی پسند اور تلاش و جستجو سے معمور ہے۔ اُن کا مزاج سخن اپنے معاصرین سے بڑی حد تک الگ نظر آتا ہے۔ ایک بڑے اور آفاقی شاعر میں جن شاعرانہ خوبیوں کا ہونا لازمی ہے وہ اُن میں موجود ہیں۔ اُن کی شاعری کے موضوعات ماضی، حال اور مستقبل میں کئی

صدیوں تک پھیلے ہوئے ہیں - اُن کی شاعری نہ صرف امکانات کی شاعری ہے بلکہ ممکنات اور مابعد ممکنات کی شاعری قرار دی جائے تو بے جا نہ ہوگا- کیوں کہ بہ اعتبار فکر و خیال، زبان و بیان، اُسلوب اظہار اور شاعرانہ ہنرمندی کی صفات سے متصف ہے اور اُن کی آواز شاعری کی معتبر و ثقہ آوازوں میں شمار کی جاتی ہے-

پروفیسر سحر انصاری کے کلام کا مطالعہ اِس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ عصرِ حاضر کے اُن بیدار ذہن شعرا کے قبیل سے ہیں جنھوں نے ماضی و حال کے اکثر زیرک، طبّاع اور سلیم الحواس شعرا کو دیکھا، سنا، پرکھا اور اُن سے شرفِ ملاقات بھی حاصل کیا ہے- اُن کے کلام کو انتقادی تناظر میں پڑھا بھی ہے -جن کے فکر و خیال اور اُسلوب سے آج کی نئی نسل شعوری و لاشعوری طور پر اِکتسابِ فیض بھی کر رہی ہے اور اُن کی شاعرانہ خوبیوں کو اپنے اُسلوبِ تازہ کے ساتھ اپنے عہد کی آواز میں ڈھال بھی رہی ہے -پروفیسر سحر انصاری کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے اپنے مزاج سے ہم آہنگ شاعری کی راہ متعین کی ہے اور اُس راہ پر تسلسل سے گام زن رہ کر جو کچھ لکھا اور کہا ہے وہ ہمارے اُردو شعری ادب عالیہ کا وقیع سرمایہ ہے-

پروفیسر سحر انصاری کی تمام شاعری اس معاشرے سے متعلق ہے اور اس معاشرے کا حصّہ بھی ہے کیوں کہ اُن کی نظموں میں بڑے شہروں کی زندگی اور بڑے انسانوں کے تجربات اور دُکھی افراد کی آہ و فغاں شامل ہے- اُن کی آواز ہر شخص کو اپنی آواز محسوس ہوتی ہے - وہ جو کچھ کہتے ہیں ہر شخص سمجھتا ہے کہ "گویا یہ بھی میرے دل میں تھا-" اُن کی شاعری اپنے ماحول کی عکاسی، حالات کی ترجمانی اور زندگی کی سچی تصویر کشی کا نام ہے- اِس میں انسان اور اُس کی زندگی سے متعلق تمام نشانات مل جاتے ہیں-

اِس خوبی نے اُنھیں عہدِ حاضر کے معتبر شعرا کی صف کا امام بنا دیا ہے- اُنھوں نے اپنے فکر و خیال اور موضوعات سے اُردو شاعری کو ایک نیا راستہ دکھایا اور ایک نیا موڑ عطا کیا ہے- اُنھوں نے جدید اور منفرد انداز اختیار کر کے یکسانیت کے تمام بت توڑ ڈالے ہیں اور اُردو شاعری میں تازہ کاری کی ایک نئی روح پھونک دی ہے- اُنھوں نے اُسلوب کی جدت سے اردو شاعری کو نئی جہت سے آشنا کیا ہے- علامتی و نیم علامتی انداز سے شاعری کے دامن کو وسیع کیا ہے ،اُن کی تمام شاعری میں عہدِ جدید اپنی تمام تر رنگینوں، سنگینیوں، رعنائیوں اور شعری تقاضوں کے ساتھ موجود ہے- اُن کی غزلیں ہوں یا نظمیں، خوب صورت افکار و اسالیب لیے ہوئے ہیں-

پروفیسر سحر انصاری کی شاعری سچائی کی صورت گری ہے۔ اس میں حیات و کائنات کے تمام حقائق اپنے پورے وجود کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی متحرک ہے، جامد نہیں۔ اُن کی شاعری حرکی ہے، جمود کی حامل نہیں۔ وہ ترقی پسند شاعر تو ہیں مگر صرف نظریات کے حصار میں قید نہیں، وہ آزاد فکر و نظر کے حامل ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم اُنھیں پورے قد و قامت والا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔

پروفیسر سحر انصاری کا کلیات ''سوادِ سخن'' جو زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے جا رہا ہے، محاسنِ شاعری کا مجموعہ ہے جس میں اُن کے دونوں شعری مجموعے ''نمود'' اور ''خدا سے بات کرتے ہیں'' شامل ہیں۔ معائبِ سخن نہ ہونے اور محاسنِ شعری کی کثرت کی بدولت اُن کے سر انفرادیت اور فضیلت کی دستار بندھتی ہے۔ وہ زندہ افکار شعرا کی صف میں سب سے آگے کھڑے نظر آ رہے ہیں۔ اُنھوں نے اُردو غزل کے جن نئے امکانات کو آغاز میں سمجھ لیا تھا، اُن کی تعمیر و تکمیل اُن کے شعری پیکر میں صاف نظر آ رہی ہے۔ اُن کا حسن و جمال اور نقش و نگاری کا عمیق ادراک اُن کی غزلوں اور نظموں سے بہ خوبی ظاہر ہوتا ہے۔

پروفیسر سحر انصاری کی شاعری کے مطالعے سے اِس بات کی شہادت بھی ملتی ہے کہ اُنھوں نے قافیہ پیمائی اور لفاظی نہیں کی، نہ بھاری بھرکم اور ثقیل و دقیق الفاظ استعمال کر کے اپنی علمیت کا رعب جھاڑا ہے بلکہ اُن کی شاعری بے حد مقصدی نوعیت کی ہے۔ وہ صرف الفاظ کی جادوگری اور خیالات و جذبات ہی کے صورت گر نہیں ہیں، اُن کی شاعری سے پیغام، درس، معنی خیز خبر اور معلومات ملتی ہیں۔ اُن کی شاعری پڑھنے کے بعد قاری اپنے دامنِ علم کو معانی و مفاہیم کے گوہرِ نایاب سے بھر کر اُٹھتا ہے۔ کیوں کہ اُن کی غزلیات کے اشعار زندگی کی حقیقتوں، وارداتوں اور مسائل و افکار سے گندھے ہوئے ہیں۔ اُن کی غزلیہ شاعری سے چند اشعار پیش کرتا ہوں جو میرے دعووں کے حق میں دلائل ہوں گے:

ہمیں اندازہ رہتا ہے ہمیشہ دوست دشمن کا
نشانی یاد رکھتے ہیں، نشانہ یاد رکھتے ہیں

☆

فصیلِ شہر میں پیدا کیا ہے در میں نے
کسی بھی بابِ رعایت سے میں نہیں آیا

☆

اِک حقیقت ہے جسم بدن کی طلب
پھر محبت کریں قیاسی کیوں

☆

مرے لہو کو، مری خاک ناگزیر کو دیکھ
یونہی سلیقۂ عرضِ ہنر نہیں آیا

☆

نہیں ہے کوئی بھی منزل اگر مری منزل
تو پھر یہ پاؤں تلے راستے کہاں کے ہیں

☆

چاہتا ہوں کہ تجھ کو پیار کروں
اِس میں تخصیصِ عارض و لب کیا

☆

وہ پاس آئے تو موضوعِ گفتگو نہ ملے
وہ لوٹ جائے تو ہر گفتگو اُسی سے رہے

☆

دنیا کی خبر لے کے کہاں جاؤں فلک پر
میں عرشِ خداوند کا جاسوس نہیں ہوں

☆

تنگ آتے بھی نہیں کش مکشِ دہر سے لوگ
کیا تماشا ہے کہ مرتے بھی نہیں زہر سے لوگ

.....

پروفیسر سحر انصاری کی نظموں کے اکثر موضوعات نئی نسل کا المیہ، کرب گہرہی، انتظار، خواب، وصال و ہجر، دانش ورانِ عہد کی بے توقیری، آتشِ احساس، سورج کا دکھ، آثارِ قدیمہ کی فکر، عہدِ فراموش کا نوحہ، حسابِ شب، ہوا کا ماتم، مردہ ضمیروں کا مرثیہ، تمنا کا عذاب، دیدۂ پُرآب کے مسائل، زندگی کے نشیب و فراز، خزاں کی ستم ظریفی، شکست و ریخت کے زاویے، ریزۂ وجود، مسافت کی اذیت، غمِ آبلہ پائی، درد کی پرچھائیں، لمحوں کے سراب، گرگِ آشتی، کش مکشِ دہر کے جھگڑے، سوادِ شب، فریب آسا زندگی، دیدۂ بے خواب اور وسائلِ زندگی سے محرومیاں ہیں۔
ظاہر ہے یہ سب موضوعات بڑی شاعری کے ہیں۔ پروفیسر سحر انصاری نے اِن موضوعات کو برتتے وقت محض سنی سنائی باتوں پر اکتفا نہیں، وہ خود ان سب مسائل و معاملات سے گزرے ہیں۔ اُنھوں نے غور و فکر کی آگ سے اپنی شاعری کو کندن بنایا ہے۔ جس طرح علامہ اقبال نے غزلیں کم اور نظمیں زیادہ لکھی ہیں اِسی طرح پروفیسر سحر انصاری نے بھی ایسا ہی کیا ہے، یہ دانستہ ہوا ہے یا نادانستہ مگر اتنا ضرور ہے کہ اُن کی مقصدی شاعری علامہ اقبال کی شاعری سے مماثلت رکھتی نظر آتی ہے۔ پروفیسر سحر انصاری نے نامساعد حالات میں صبر و شکر سے کام لیا ہے، وہ کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوئے، نہ اُن پر قنوطیت طاری ہوئی ہے۔
پروفیسر سحر انصاری نے پابند نظمیں بھی لکھی ہیں اور آزاد و معریٰ بھی۔ اُن کی نثری نظموں کی تعداد سب سے کم ہے۔ پابند نظمیں سب سے زیادہ توانائی لیے ہوئے ہیں، جس موضوع کو بھی اُنھوں نے بیان کرنا چاہا ہے اُسے خوبی کے ساتھ بیان کرکے اُس کا حق ادا کردیا ہے۔ اُن کی نظموں میں منظر کشی غضب کی پائی جاتی ہے۔ وہ الفاظ کے سچے صورت گر ہیں۔ وہ نظموں میں اپنے جذبات و مشاہدات کو بھی شاعرانہ جمال کے ساتھ بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اُن کی منظومات کے مصرعے ایک دوسرے سے مربوط و پیوستہ و ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ نظم میں یہی بات اہمیت کی حامل ہے۔ اُن کی ایک نمایندہ نظم ''خدا سے بات کرتے ہیں'' ملاحظہ فرمائیں جس سے اُن کی نظم نگاری کی تمام

خوبیاں آشکار ہو رہی ہیں:
نظر کے سامنے تاریخِ بابل خوں چکاں آئی
شہیدوں کی زباں میں داستانِ درد ستاں آئی

یہیں نمرود نے اس شہر کی بنیاد رکھی تھی
یہیں فرزندِ آزر نے
دہکتی آگ کو گلزار کا مژدہ سنایا تھا
حمورابی، بخوکدنصر تھے آئین ساز اس کے
چھپے ہیں اس زمیں میں ریزہ ریزہ سارے راز اس کے
مقدر اس زمیں کا وقفِ نیرنگِ زمانہ ہے

فراتِ اشک میں، یا دجلۂ خوں میں نہاتا ہے
مرے دل کو گلہ ہے آج پھر عشتارِ بابل سے
اسے تو عشق پر اور جنگ پر یکساں ہی قدرت ہے
اٹھی پھر عشق کو رد کر کے وہ کیوں جنگ کی خاطر
چلو ہم بُرجِ بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

اندھیروں کے شکنجوں میں ابھی تک کیوں اُجالے ہیں
جو مظلوموں کی لاشوں پر بھیانک رقص کرتے ہیں
وہ کرگس کس نے پالے ہیں
تمدن ساز نقاشوں کی تخلیقات کے ہوتے
سگانِ خیرہ سر کیسے گلی کوچوں میں آپہنچے

تباہی کے مناظر ہم نے خود آنکھوں سے دیکھے ہیں
کہیں شعلے بھڑکتے ہیں، کہیں لاشے تڑپتے ہیں
دعا ئے کاذب وزراں میں بچوں کی خطا کیا تھی
نہتی عورتوں، معصوم بچوں کی خطا کیا تھی؟
چلو ہم بُرجِ بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

ہمت کس سمت سے ملتی ہے اب اقصائے عالم میں
کسی کو ظلم کرنے کی، کسی کو ظلم سہنے کی
ستم کاروں کے لشکر فتح پاتے ہیں تو کیوں آخر
رواں ہے بستیوں میں کس لیے سیلابِ خوں آخر
جہنم سے زیادہ تند شعلے کیوں دہکتے ہیں

یہ بے تابوت لاشے کس کی آخر راہ تکتے ہیں
چلو ہم بُرجِ بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

جو گھر میں اک دیے کی روشنی کرنے سے قاصر ہوں
وہ دہشت گرد کہلائیں!
جو لمحہ بھر میں زندہ بستیاں تاراج کر ڈالیں
وہ امن و آشتی و صلح کے ہمدرد کہلائیں!
وہ دن ماتم کے دن تھے جب سیہ کاروں کے لشکر میں
خوشی کے شادیانے بج رہے تھے حلقہ در حلقہ
وقار و عزت و ناموس ہیں، اب نوحہ خوانوں میں
انہیں بیچا گیا ہے بے ضمیری کی دکانوں میں
نہ میزانِ عدالت ہے، نہ احساسِ ہلاکت ہے
کوئی قانون بھی باقی رہا ہے تیری دنیا میں؟
چلو ہم بُرجِ بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

کروڑوں رینگتے انساں ہیں اب بھی نعرہ زن ہر دم
کوئی آواز اب جاتی نہیں کیوں تیری ہیکل تک
حریری شبنمی لہجوں کی تجھ کو کیا ضرورت ہے

تجھے تو آگ کے شعلوں سے آتا ہے سخن کرنا
چلو ہم بُرجِ بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

چلو اُس وقت سے پہلے کہ ہم سب گنگ ہو جائیں
مبادا اپنے اپنے غم کدوں میں جا کے سو جائیں
ہمارے تیر مٹ جائیں، کمانیں چھین لی جائیں
مبادا پھر ہماری ہی زبانیں چھین لی جائیں
چلو ہم بُرجِ بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

.....

میں نے پروفیسر سحر انصاری کی شاعری سے کم نمونے مضمون کو طوالت سے بچانے کے لیے پیش کیے ہیں، اُن کی تمام غزلیات اور منظومات تو آپ اُن کے کلیات ''سوادِ سخن'' میں مطالعہ کر ہی لیں گے۔ اس مقالے کا بنیادی مقصد اُن کے فکری و فنی اور تخلیقی لحاظ سے شعری محاسن اور رموز و نکات پیش کرنا ہے۔

پروفیسر سحر انصاری کی شاعری کا آئینہ خانہ وسیع ہے۔ اِس میں سیکڑوں آئینے رکھے ہوئے ہیں جن میں قدِ آدم آئینے بھی ہیں اور ذرا چھوٹے آئینے بھی، لیکن جتنے آئینے ہیں بے حد صاف ہیں، کسی شفاف تالاب کی طرح۔ جس میں دیکھنے والوں کو اپنا عکس شفاف نظر آتا ہے، اگر دیکھنے والا بصارت کے ساتھ بصیرت سے بھی کام لے تو اُسے اپنے ظاہر وجود کی شعاعیں باطنی وجود کو بھی تصورات میں منعکس کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ اُن کے اشعار زندگی سے گلے بھی مل رہے ہیں اور جدا بھی ہیں، اُن میں تاریک زندگی کے عکس بھی ہیں اور روشن حیات کے چہرے بھی، معاشرے کا جو چہرہ ہے اُس کے خدوخال مسحور کن بھی ہیں اور نہیں بھی، وہ لفظوں کے سچے مصور ہیں۔ اُن کے یہاں زندگی کی تصویر کے دونوں رخ دِکھائے گئے ہیں۔ وہ یک رخی زندگی (زخم خوردہ) کا نوحہ نہیں لکھتے اور نہ دوسرے رخ (پُرآسائش) کا قصیدہ پیش کرتے ہیں بلکہ زندگی کے دونوں رخوں کو ٹھیک ٹھیک زاویوں سے پیش کر دیتے ہیں تاکہ انسان زندگی کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھ لے۔

پروفیسر سحر انصاری حقیقت پسند شاعر ہیں۔ اُن کا لکھا ہوا سچ ہے اور ہر لفظ سچائی کا چہرہ سامنے لاتا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں خیال کی ندرت اور تخیل کی جدت سے ایسی توانائی بھر دیتے ہیں جو قاری کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، وہ مبہم و غیر واضح بات کرنے کے قائل نہیں ہیں، اُن کی غزلیں ہوں یا نظمیں، مقناطیسی کشش رکھتی ہیں۔ اُن کا شعر صوری و معنوی دونوں خوبیوں کا حامل ہوتا ہے یعنی الفاظ بھی صفتِ ساحری سے متصف ہوتے ہیں اور معنی بھی دل و دماغ میں اُتر جانے کا وصف رکھتے ہیں۔

یہ تمام خوبیاں بڑی شاعری کی نشانیاں ہیں اِس لیے ہم بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر سحر انصاری عہدِ حاضر کے نمایندہ شاعر ہیں جن کی شاعری کی چکاچوند سے ایک عالم تادیر منور رہے گا۔

☆☆☆☆☆

معتبر شاعرہ منصورہ احمد کی متنازعہ شخصیت

ولادت۔یکم جون 1958 حافظ آباد ------وفات۔8.جون 2011 لاہور

محترمہ ادا جعفری، کشور ناہید، زہرہ نگاہ، پروین فنا سید، فہمیدہ ریاض اور اسی درجے کی چند اور شاعرات کے قلم کی جنبش جب سست روی کا شکار ہوگئی یا یوں کہیں کہ ان کی شاعری منظرِ عام پر آنا جب کم ہوگئی تو دلدادگانِ شعروادب نے شاعرات کے تخلیقی جوہر کی کمی کا شدت سے احساس کیا ایسے میں اچانک متعدد شاعرات سامنے آئیں--- ان میں ایک نام پروین شاکر کا بھی تھا جبکہ سارہ شگفتہ کی آزاد اور نیم آزاد یا نثری نظمیں بھی اسی عہد میں مگر کم کم سامنے آئیں کیونکہ وہ اپنی نظمیں شائع کروانے کے بجائے امرتا پریتم کو لکھ کر بھیجنے کو ترجیح دیتی تھیں----- نورین طلعت عروبہ، نوشی گیلانی، شاہدہ نور و دیگر نے اپنی شاعری شائع کرنے کروانے اور مشاعرے پڑھنے پر زیادہ توجہ دی بیشک محترمہ ماہ طلعت زاہدی کو شاعرات میں ایک بلند اور اعلی مقام حاصل رہا ہے اور ان کی حیثیت مسلمہ ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ مشاعروں سے گریزاں رہیں۔ اور جہاں تک شاعری کی اشاعت کا تعلق ہے تو ہمیں کہہ لینے دیجئے کہ محترمہ ماہ طلعت زاہدی اس معاملے میں بھی معیار کو مدنظر رکھتی تھیں۔ چند مخصوص اور معیاری ادبی رسالوں اور جریدوں کو ہی اپنی تخلیقات بھیجتی تھیں۔ جبکہ منصورہ احمد بھی مشاعروں کی واہ واہ سے دور رہیں اور اپنی شاعری کو اپنے یا اپنے مخصوص اور قریبی حلقے تک محدود رکھنے میں کامیاب رہیں--- پروین شاکر، نوشی گیلانی اور نیلما ناہید درانی ہم عصر تھیں --- نیلما ناہید درانی کا تعلق محکمہ پولیس سے تھا --- جو ایس ایس پی کے عہدے سے ریٹائر ہوئیں۔ مگر دوران

ظفر معین بلے جعفری

سروس ہی انھوں نے شاعری افسانہ نگاری سفر نامہ نگاری جاری رکھی--- وہ بھی اپنی پہلی کتاب--- جب تک آنکھیں زندہ ہیں کی اشاعت (1986) سے بلے ہاوس کی ادبی محافل میں شرکت کرتی رہیں ہیں

ان سب میں پروین شاکر کی شاعری سب سے زیادہ مشہور اور ممتاز قرار پائی، نوشی گیلانی کی شخصیت اور شاعری دونوں ہی کو متنازعہ بنا کر پیش کیا جانے لگا اور پھر اچانک پروین شاکر ایک ''مبینہ'' حادثے میں داغ مفارقت دے گئیں--- ادھر ''فنون'' میں منصورہ احمد کی خوبصورت نظمیں پہلے ہی شائع ہو رہی تھیں اور ان کے مداحوں کا حلقہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے منصورہ احمد تمام شاعرات میں سب سے منفرد اور بلند قامت نظر آنے لگیں مگر ابھی تک منصورہ احمد کا کوئی شعری مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔

منصورہ احمد کا پہلا شعری مجموعہ ''طلوع'' 1997 میں شائع ہوا۔ 1998 میں طلوع کو وزیر اعظم ادبی ایوارڈ ملا۔ احمد ندیم قاسمی کے 81 ویں جشنِ ولادت کے موقع پر منصورہ احمد کا پہلا شعری مجموعہ ادبی افق پر ''طلوع'' ہوا۔

یہ حقیقت ہے کہ بڑے لوگ بہت کم کم ہی ہوتے ہیں بلکہ ایک ارب تیس چالیس کروڑ کی آبادی کو صرف ایک ''گلزار'' میسر آسکا۔ اس ایک گلزار نے لاکھوں تخلیق کاروں میں بھی جداگانہ حیثیت کو تسلیم کروالیا اور سرحدوں سے (صرف جغرافیائی سرحدوں سے) پار بھی گلزار کو لاکھوں پرستار میسر آئے اور وہ گلزار کہ جس کے ایک مصرع ''ہم نے دیکھی ہے ان آنکھوں کی مہکتی خوشبو'' نے منصورہ احمد کی تخلیقی اپج کو منظرِ عام پر لانے اور جوالا سلگانے میں اہم کردار ادا کیا اسی منصورہ احمد کو تخلیق کے ایک گھنے شجر کی ٹھنڈی اور مہکتی چھاؤں سے فیض یاب ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے اگر آپ منصورہ احمد کی نجی حلقے پر نظر ڈالیں تو آپ کو اس میں شامل ہر شخص کسی نہ کسی اعتبار سے علم و ادب اور تخلیق کاری میں پیش پیش نظر آئے گا اور پھر اگر آپ ''حلقہ فنون'' اور حلقہِ اساطیر کی طرف آئیں گے تو شاید اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ علمی، ادبی اور تخلیقی سطح پر جو جس قدر بلند مرتبے کا حامل ہوگا منصورہ احمد کے لیے اس قدر قابلِ تکریم ہوگا۔

منصورہ احمد کی خوبصورت شاعری کا مطالعہ کرتے وقت احساس ہوتا ہے گویا ہم خود بھی ان کے ہمراہ ہیں اور ہر منظر اور موضوع کو محسوس کر رہے ہیں مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ قاری تخلیق کار کے ساتھ آدھے سفر تک ہی ہمسفر رہتا ہے کیونکہ وہ تو پاتال میں اس قدر گہرائی تک اترتی ہیں کہ جہاں سے دوبارہ ابھرنا یا باہر نکل آنا ہر ایک کے بس میں نہیں۔

منصورہ احمد ایک شدت پسند شاعرہ ہے بہت سی چھوٹی چھوٹی اور معمولی بلکہ معمولی سے معمولی بات کا شدت سے احساس کر کے پھر اسی شدتِ احساس کو شعری پیکر عطا کر دیتی ہیں، کبھی کبھی تو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس

قدر حساس ہونا خود تخلیق کار اور اس کے قاری دونوں کے لیے خطرناک ہے اور بے شک منصورہ احمد ان خطرات سے کھیلتی ہیں اور ان خطرات سے کھیل کر ہی کھل کر سامنے آتی ہیں۔۔۔۔ منصورہ احمد کے مشاہدات اور تجربات انتہائی تلخ ہیں انہوں نے جو کچھ دیکھا 'سنا' سمجھا، پایا اس کو اسی انداز میں محسوس بھی کیا اور محفوظ بھی ''طلوع'' کا مطالعہ کر کے یہ بات انتہائی وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ منصورہ احمد کی تخلیقی اپج سے انکار ممکن ہی نہیں البتہ طلوع پڑھ کر ایک اور احساس بھی ہوتا ہے بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوتا کہ ''طلوع'' کا قاری خوف زدہ ضرور ہوتا ہے کیونکہ وہ تخلیق کاری کی اس شدت بلکہ حدت کو برداشت نہیں کر پاتا۔۔۔۔ اور ایسا اس وجہ سے بھی ہوتا ہے کہ منصورہ احمد کی شاعری کی کیفیت ایسی ہے ہی نہیں کہ اس سے یکدم باہر آیا جا سکے اور یہ انداز اور اعزاز کم بلکہ بہت کم تخلیق کاروں کو حاصل ہوتا ہے یقیناً منصورہ احمد انہی میں سے ایک ہیں۔

میری خواہش تو یہ تھی کہ میں منصورہ احمد کی نظموں میں سے چند نظمیں منتخب کر کے اس کے اقتباسات بھی شامل تحریر کروں لیکن نہیں یہ کام بہت کٹھن ہے۔ منصورہ احمد کی تمام تر تخلیقات منتخب شدہ ہیں شاید مجھ سے مزید انتخاب نہیں ہو پائے گا۔ مجھے منصورہ احمد کے ''طلوع'' میں کوئی تخلیق تو کجا ایک مصرع تک ایسا محسوس نہیں ہوا جس کو میں نسبتاً کم اچھا کہہ سکوں۔۔۔۔ بہر طور بحالتِ مجبوری چند نظموں کے اقتباسات شاملِ تحریر کرنا برائے حوالہ اشد ضروری ہے۔۔۔۔

مگر پہلے منصورہ کی شاعری کے حوالے سے جون ایلیا کی رائے ملاحظہ ہو۔۔۔۔ وہ کہتے ہیں کہ ''منصورہ احمد ایک زبردست شاعرہ ہے اور پنجاب میں تو اس سے بہتر یا اس کے پائے کی شاعرہ ہے ہی نہیں۔۔۔۔'' ''طلوع کی اشاعت پر پروفیسر طاہر تونسوی کے تاثرات بھی توجہ طلب ہیں ملاحظہ ہوں ''طلوع کی اشاعت ادبی دھماکہ قرار پایا۔۔ اور یہ ثابت ہو کر رہا کہ منصورہ احمد منفرد اور چونکا دینے والے لہجے کی ایک خوبصورت شاعرہ ہے اور ان کے پہلے ہی شعری مجموعے ''طلوع'' نے ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے۔''

گلزار لکھتے ہیں کہ ''منصورہ ایک کولمبس ہے۔۔۔۔ سمندروں پہ سفر کرتی ہے اور زندگی کے نئے نئے جزیروں کو تلاش کرتی ہے وہ جزیرے کبھی ایک صورت کی صورت میں نظر آتے ہیں کبھی تواریخ کی صورت۔۔۔ اس کی نظمیں پرسنل بھی ہیں اور اپنے دور کی روداد بھی اس کے مصرعے سانس لیتے ہیں تو چھو جاتے ہیں کبھی صبا کی صورت کبھی روشنی کے چھینٹے کی طرح۔۔۔۔ اس کی سطروں میں وقت کی تہیں رکھی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اس کی نظم پڑھ لینے کے بعد کئی بار محسوس ہوا کہ نظم کی افشاں میرے ہونٹوں پہ رہ گئی!۔۔''

منصورہ احمد کی نظمیں ہی نہیں بلکہ غزلیں بھی حد درجہ خوبصورت ہیں۔۔۔۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں لیکن اس سے قبل ایک چھوٹی سی بات اور وہ۔ یہ لازمی نہیں ہے لیکن عام طور پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اردو ادب کے ایسے تخلیق کار کہ جن کا تعلیمی یا مطالعاتی پس منظر انگریزی ادب یا پھر دیگر زبانوں اور اردو ادب سے وابستہ رہا ہوتا ہے تو ان کی تخلیقات کی انفرادیت انہیں جداگانہ پہچان عطا کرتی ہے۔ اس حوالے سے بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن شاعرات میں ہی دیکھ لیجے تو بالکل سامنے کی مثالوں میں محترمہ پروین شاکر، محترمہ ماہ طلعت زاہدی، محترمہ فہمیدہ ریاض اور خود محترمہ منصورہ احمد اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے نام ہیں۔ منصورہ احمد کی غزلیں بھی حد درجہ خوبصورت ہیں ----- چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زندگی موت کی امان میں ہے
چھاؤں سورج کے سائبان میں ہے

کل عدالت لگائیں گے بچے
محتسب آج کس گمان میں ہے

تمام شہر میں تیرہ شبی کا چرچا تھا
یہ اور بات کہ سورج افق پہ نکلا تھا

عجیب وجہ ملاقات تھی مری اس سے
کہ وہ بھی میری طرح شہر میں اکیلا تھا

میں سب سمجھتی رہی اور مسکراتی رہی
مرا مزاج ازل سے پیمبروں سا تھا

میں اس کو کھو کے بھی اس کو پکارتی ہی رہی
کہ سارا ربط تو آواز کے سفر کا تھا

میں گل پرست بھی گل سے نباہ کر نہ سکی
شعور ذات کا کانٹا بہت نکیلا تھا

سب احتساب میں گم تھے ہجوم یاراں میں
خدا کی طرح مرا جرم عشق تنہا تھا

وہ تیرے قرب کا لمحہ تھا یا کوئی الہام
کہ اس کے لمس سے دل میں گلاب کھلتا تھا

مجھے بھی میرے خدا کلفتوں کا اجر ملے
تجھے زمیں پہ بڑے کرب سے اتارا تھا

فراق آثار لمحوں کی دہائی کون دے گا
ترے چہرے کے سورج میں دکھائی کون دے گا

مجھے اک بات کہنا ہے اسے کتنے یگوں سے
مگر صحرا کی وسعت میں سنائی کون دے گا

جو اک بیکل سی خوشبو میرے اندر پھوٹتی ہے
اسے اس کے دریچے تک رسائی کون دے گا

کسی کی قید سے چھٹنا تو خیر اک مسئلہ ہے
مجھے میرے ہی زنداں سے رہائی کون دے گا

میں سلطاں کے درِ دولت پہ اک دستک تو دے لوں
مگر اس ہاتھ کو ذوقِ گدائی کون دے گا

اس سے کرنا گفتگو بس آتے جاتے موسموں کی
اور سرگرداں ہوا سے اپنے دل کی بات کہنا

اب تو اس کی جستجو کا ایک ہی انداز ٹھہرا
تتلیوں کے ساتھ پھرنا خوشبوؤں کے ساتھ رہنا

پھر کسی کی آنکھ میں دیکھا گیا ہے موسمِ گل
کتنے دن کے بعد میں نے کوئی کھلتا رنگ پہنا

کوبہ کو پھرتے ہی کٹ جائے گی ساری عمر اپنی
کیا سرابوں کے نگر میں منزلوں کی قید سہنا

اک بھنور میں گھومتی ہے سانس کی کشتی ازل سے
اپنی فطرت ہی کہاں تھی پانیوں کے ساتھ بہنا

مجھ کو حیرت کی صلیبوں سے اتارے کوئی
بے صدا شہر میں رو کر ہی پکارے کوئی

کل تجھے دیکھنا چاہا تو عجب بات ہوئی
آنکھ پر ٹانک گیا چاند ستارے کوئی

میں تری ذات سے باہر بھی تری ذات میں ہوں
کیسے دکھلائے مجھے میرے کنارے کوئی

اس نئے دور میں بچوں پہ یہ کیا وقت پڑا
آگ میں جھونک گیا ان کے غبارے کوئی

کس طرح ناؤ چلے اتنے چڑھے پانی میں
تیری یادوں کا سمندر تو اتارے کوئی

رات کی آنکھ میں میرے لئے کچھ خواب بھی تھے
یہ الگ بات کہ ہر خواب میں گرداب بھی تھے

زندگی بانجھ سی عورت تھی کہ جس کے دل میں
بوند کی پیاس بھی تھی آنکھ میں سیلاب بھی تھے

زخم کیوں رسنے لگے اک ترے چھو لینے سے
دکھ سمندر تھے مگر موج پایاب بھی تھے

چاند کی کرنوں میں آہٹ ترے قدموں کی سنی
اور پھر چاند کے ڈھل جانے کو بیتاب بھی تھے

کتنا آباد مرے ساتھ تھا سایوں کا ہجوم
کیسے تنہائی کے صحرا تھے جو شاداب بھی تھے

منصورہ احمد کی یہ بھی ایک انفرادیت ہے کہ بقول احمد ندیم قاسمی کے ''منصورہ کی بیشتر نظموں کا انجام ایک سوال ہوتا ہے'' اور یہ بھی ایک حقیقت

ہے کہ ان کی نظموں کے اختتام پر جو سوال ہوتے ہیں وہ معنی خیز بھی ہوتے ہیں اور قاری کو جھنجھوڑتے بھی ہیں --- چند سوال کہ جن پر ان کی نظمیں اختتام پذیر ہوئیں ملاحظہ ہوں:

سوچ رہی ہوں ایسا کیوں ہے؟

تم کو لا کے کہاں بٹھاؤں؟

آج ہاتھوں پر دیے رکھ کر جلا پائے گا کون؟

کیسے کہے کوئی؟

شام آنے سے پہلے سورج کو کیوں
دفناؤں---؟

بولو جگنو تھام سکو گے؟

کس کا ہاتھ ہے شاہ والا -----؟

ان سب کی جوانی کون جیتا ہے---؟

کدھر جاؤں---؟

کوئی ہے ------؟

میں اس کو ڈھونڈے آخر کہاں جاؤں---؟

تو میری زندگی آغاز کب ہوگی-----؟

اپنے سینے سے لگائے گا---؟

ہمارے لفظ کب تک تکذیب کی سولی اتریں گے---؟

مگر یہ کیسے ممکن ہے---؟

منصورہ احمد کی نظموں میں بہت خوبصورت بلکہ کہیں کہیں تو انوکھے سوال بھی ملتے ہیں "ایک سوال" میں ایک نہیں کئی سوال ہیں ----
ایک سوال کے ایک اقتباس میں بھی آپ کو کئی سوال نظر آئیں گے ملاحظہ ہوں:

تم نے تو رستے دیکھے ہیں
یہ تو بتاؤ
کیا اس سے مجھ تک آنے والے سب رستوں پر
کرچی کرچی ہجر اگا ہے؟
کیا ہر موڑ پہ
آدھی زندہ تتلی کی
پاگل چیخوں کا شور بپا ہے؟
کیا اس نے بھی بارش کی اک بوند کی خاطر
میری اکلوتی گڑیا کو
جلتی آگ میں جھونک دیا ہے؟
اپنے گھر کو لوٹ آنے والی ننھی چڑیو!
کچھ تو بتاؤ!

.....

جبکہ "مرے مالک" میں سوال بھی انوکھا ہے اور سوال کرنے کا انداز بھی دیکھیے:

مرے مالک
تجھے تو علم ہی ہوگا

جو بچپن سے بڑھاپے میں چلے جاتے ہیں
ان سب کی جوانی کون جیتا ہے — ؟

''تم اور سورج'' بھی منصورہ احمد کی مختصر اور خوبصورت نظموں میں سے ایک ہے ---اور یہ وہ نظم ہے جس کو پڑھ کر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ منصورہ احمد تقابلی جائزے کے ہنر سے بھی بخوبی واقف ہیں ---اور تقابلی جائزے میں جب تک تنقید کا عنصر شامل نہ ہو تو یقیناً تشنگی رہ جاتی ہے مگر آپ خود فیصلہ کریں کہ منصورہ احمد کی تم اور سورج کیسی مثال ہے

---تم اور سورج---

تم اور سورج اک جیسے ہو
دونوں آنگن میں اترو تو جھلمل ہونے لگتی ہے
دونوں کی حدت سے دل کی برف پگھلنے لگتی ہے
دونوں آنکھ کی وسعت سے بڑھ جاتے ہو
دونوں آنکھیں چندھیاتے ہو
دونوں آگ میں جھلساتے ہو

منصورہ احمد کی خوبصورت نظموں میں قدرت اور فطرت کے حسین مظاہر کا ذکر شدت کے ساتھ ملتا ہے:

عجب لہجہ ہے اس کا

پانیوں پر جھلملاتی چاندنی جیسا
مرے دل کا سمندر جب بھنور کی زد میں آجائے
کبھی تاریک لہریں گھیر کر مجھ کو
کسی پاتال کا رستہ دکھاتی ہوں
تو وہ ایسی صفت لہجہ
مجھے پھر ساحلوں پر کھینچ لاتا ہے
مجھے کہتا ہے دیکھو
اس بھنور کے پار بھی دنیا میں کچھ لمحے ٹھہرتے ہیں
انہیں بھی اپنی سانسوں میں پرو کر دیکھو
یہ لہریں جو کہ اندھیاروں میں دیو آثار لگتی ہیں
انہیں تم چاندنی میں دیکھنا یہ کس طرح
کرنوں سے مل کر ماجرے تخلیق کرتی ہیں
یہ لہریں جب رو پہلے نور کی ندی میں ڈھلتی ہیں
تو مستی میں مچلتی آسمانوں کو لپکتی ہیں
اماوس جب بھی آئے چاندنی کو یاد کر لینا
مرے چاروں طرف میلوں پہ چلتی دھوپ پھیلی ہے
مگر اس کی یہ باتیں بارشوں کی بوندیوں جیسی
مرے دل کی دراڑوں میں
ہری فصلیں اگاتی ہیں
میں سر سے پاؤں تک
شبنم سے بھیگی پتیوں میں ڈوب جاتی ہوں

گواہی

وہ سیڑھی جو مرے دل سے
تمہارے دل کے گنبد پر اترتی ہے
شکستہ ہے
وہ کھڑکی جو تمہارے گھر میں کھلتی ہے
مری پہچان اور مکڑی کے جالوں سے اٹی ہے
زنگ خوردہ ہے
گواہی دے نہیں سکتے نہ دو
لیکن مرا اک کام تو کر دو
مری پہچان میں الجھے ہوئے مکڑی کے سب جالے
مجھے دے دو

کوئی تو ہو جو مجھ کو میرے ہونے کی گواہی دے

کوئی آواز دیتا ہے

کوئی آواز دیتا ہے
حریر و پرنیاں جیسی صداؤں میں
کوئی مجھ کو بلاتا ہے
کچھ ایسا لمس ہے آواز کا جیسے
اچانک فاختہ کے ڈھیر سے کومل پروں پر ہاتھ پڑ جائے
اور ان میں ڈوبتا جائے
بہت ہی دور سے آتی صدا ہے
میں لفظوں کے معانی کی گواہی دے نہیں سکتی
مگر ہر لفظ میں گھنگھرو بندھے ہیں
حریم جان میں ان کے پاؤں دھرتے ہی
کئی بے چین پازیبیں دھڑکتی ہیں
لمحوں میں ایک دیوالی سی بجتی ہے
کوئی آواز دیتا ہے
حریر و پرنیاں جیسی صداؤں میں
کوئی مجھ کو بلاتا ہے

صدیوں پیچھے

سنتے ہیں کہ نسلوں پہلے
چین کی باغی شہزادی نے
اپنی دنیا تک جانے کے پاگل شوق میں
آنگن کی دہلیز لانگی
اور گلیاں شہر راہیں ناپتی
اک پھلواری تک جا پہنچی
رسموں کے ٹھیکے داروں نے
جرم تمنا کی پاداش میں حکم سنایا
اب دنیا میں آنے والی ہر ہوا کو

سیاست

جب ہم چھوٹے چھوٹے سے تھے
ہم سایے میں ایک بڑی بی رہتی تھی
گلی محلے کے سب بچے اس کو ماسی کہتے تھے
ماسی کی اک عجب ادا تھی
گلی محلے کے جس بچے پر بھی اس کا داؤ چلتا
مکوں اور دھموکوں سے
ادھ موا سا کر کے خود چھپ جاتی
فریادی بچے کی آہ و زاری سن کر
رستہ چلنے والے یا بچے کے اپنے آجاتے تو
مجمع چیر کے سب سے پہلے ماسی آتی
رونے والے بچے کو سینے سے لگاتی
شہد بھرے لہجے میں کہتی
میرے پیارے
آنکھ کے تارے
کس نے مارا
بچہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے
ماسی کو تکتا رہ جاتا
اور قصہ ٹھنڈا ہو جاتا
ہم سب بچے
ناسمجھی میں
ماسی سے نفرت کرتے تھے
مورکھ تھے نا
ماسی کے اصلی قد کو پہچان نہ پائے
اب جا کر یہ سمجھ سکے ہیں
گھر گھر برتن مانجھنے والی اپنی ماسی
کتنی بڑی سیاست داں تھی

[جاری ہے۔]

مجید امجد کا تخلیقی جوہر

مجید امجد اردو ادب کی شعری تاریخ کا ایک بڑا حوالہ ہیں۔ انھوں نے غزل اور نظم ہر دو میدان میں اپنا خوب نام کمایا خاص طور پر جب بھی اردو نظم کی بات ہوگی تو مجید امجد کو سنہری حروف میں یاد کیا جائے گا کیوں کہ انھوں نے اس دور میں نظم کو دوام بخشا جب تخلیق کار کی توجہ کی رانی غزل بنی ہوئی تھی۔ ان کے شعری تنوع، اسلوب، تازہ کاری، رنگا رنگی، بوقلمونی اور جدت فکر کی وجہ سے اردو نظم کو طاقت اور اعتبار ملا۔ ان کے ساتھ یا ذرا سا پہلے میرا جی، ن۔م راشد، اختر الایمان اور فیض جیسے مہان پہاڑ قامت نظم کے شاعر موجود تھے انھوں نے ان کے درمیان سے اپنا اسلوب وضع کیا اور نہایت سنجیدگی سے اردو ادب میں قدم جمائے۔ ان کے موضوعات نہ تو آفاقی ہیں اور نہ ہی کسی اور دنیا کے بلکہ انھوں نے انسانی نفسیات، معاشرے کا کرب، معروضی سیاسی سماجی صورت حال اور عوامی مشکلات کو پیش نظر رکھا۔ وہ انسانی نباض ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے تخلیقی بیانیے کے لیے خام مواد اپنے گردو پیش پھیلی آپا دھاپی کا شکار اور مصائب و انارکی سے دوچار عوام سے حاصل کیا۔ انھوں نے متوسط طبقے

شاہدہ دلاور شاہ

کے آشوب عصر کو محل نگاہ رکھا۔ اگر چہ ان کے زمانے میں کچھ ادبی وسیاسی تحریکیں پروان چڑھ رہی تھی اور کچھ دم توڑ رہیں تھی مگر مجید امجد اپنی موج میں گم، اپنی ہی دھن میں کام کیے جا رہے تھے۔ نہ تو وہ کسی تحریک سے وابستہ ہوئے، نہ ہی انھوں نے کسی کے چھوڑے ہوئے خاص بنیادوں پر مبنی نظریے کو اپنایا اور نہ کسی پروپیگنڈا کا شکار ہوئے۔ وہ جس انسانی قبیل سے تھے انہیں کے دکھ درد محسوس کرتے رہے وہ کہتے ہیں:

اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انہیں دے دوں جو بن پڑے

.....

انسانیت کی مظلومیت، ان پر ڈھائے جانے والے استبداد اور انسان کی بے کسی و بے اطمنانی پر بات کرتے ہوئے انہیں حجاب نہیں۔ وہ ''نژاد نو'' میں فرماتے ہیں:

طویل تاریکیوں میں کھو جائیں گے جب
ایک دن
ہمارے سامنے
اس اپنی دنیا کی لاش اٹھائے
تو سیل دوراں کی کوئی موج حیات ساماں
فروغ فردا
کا رخ پہ ڈالے مہین پردا
اچھل کے شاید
سمیٹ لے زندگی کی سرحد
کے اس کنارے
پہ گھومتے عالموں کے دھارے
یہ سب بجا ہے بجا ہے--- لیکن

.....

مجید امجد کو شاعر فطرت بھی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ انھوں نے اپنی شاعری میں فطرت کے سارے رنگ پیش کیے ہیں۔ وہ پیڑوں، پرندوں، پودوں، رنگوں پھولوں اور سبزے سے عشق کی حد تک والہانہ لگاو رکھتے ہیں۔ وہ ان سے انسانی رشتوں کی طرح پیار کرتے ہیں۔ کچھ نقاد اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ انسانی محبت سے محرومی، اپنوں کی بے رخی اور محبوب کی لاپرواہی نے ان کے اندر کے محبتی انسان کو احساس کمتری کا شکار کر رکھا تھا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نیچر اور اس میں پنپنے والے سارے رنگ اور خوشبوئیں اپنے تخیل میں سمو کر شاعری کشید کی۔ ترقی کی دوڑ اور مشینی زندگی میں مظاہر فطرت سے جڑت انکی محبت کا واضح ثبوت ہے۔ انہوں نے صنعتی شہروں کی تنگ مزاجی، ان کے معاشرے پر پڑنے والے اثرات کو دل کھول کر اپنی شاعری میں اجاگر

کیا ہے۔ مجید امجد نے اپنی شاعری میں علامت کا بھرپور استعمال کیا اور علامتوں سے معاشرتی و سماجی قباحتوں کو زمانے کے سامنے رکھا۔ انھوں نے حالات کے مدوجزر اور اشیائے مظاہرات کو اپنی شاعری میں موزوں انداز سے پیش کر کے حیات و کائنات کے مسائل کی گرہیں کھولی ہیں۔ مجید امجد کے ہاں روایتی نظمیہ ہیئت کا خمیدہ و فرسودہ نظام مفقود ہے۔ انھوں نے پابند، آزاد اور معریٰ تینوں ہیئتوں کو برت کر اپنا مقام خود متعین کر لیا ہے۔ اگرچہ ان کی آزاد نظم پر میراجی اور اختر الایمان کے اسلوب کے رنگ کا اعتراض ہے مگر اس کے باوجود بھی ان کی نظم موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے ان دونوں شعرا سے الگ اور منفرد کھڑی نظر آتی ہے۔ چوں کہ دونوں کے ہاں فارسی لفاظی اور نامانوس الفاظ کی زیادتی ہے جو کہیں کہیں مجید امجد کی نظم کو وہاں لا کھڑا کرتی ہے۔ مجید امجد کے مشاہدے، تجربات، تشبیہات و استعارات اور شاعری میں نئی ہیئتی تکنیک نے انہیں یگانہ روزگار تخلیق کار بنا دیا ہے۔ ان کی سادگیء طبع، اسلوب کی انفرادیت، فنی و فکری تاب سے ان کے شعری قویٰ کو تراوت و دیعت ہوئی۔

انھوں نے انسانی قدروں کے زوال پزیر نوحے، انسانی خواہشات کے استحصال اور ان پر جبراً اتارے جانے والے عذاب کو اپنی نظموں اور غزلوں کا موضوع بنایا۔ ان کی شاعری کے سینے میں فطرت کے مظاہر، گلی محلے پر بیتی آفتیں، پہاڑوں، میدانوں، سناٹے پر بیتے دکھ دھڑکتے ہیں۔ جو موضوعات اور مسائل عام نظر صرف نظر کر دیتی ہے وہی ان کی نگاہ قعر کا مرکز ہوتے ہیں۔ بھکارن، امروز، گاڑی، پنواڑی، گھروں کے کمرے، پیالیاں، باغ، آنگن، گلیاں، بس اسٹینڈ، حجرہ، کھلیان کھیت، دھڑکنیں، سانس غرض باریک سے باریک واقعات و اشیاء و مظاہرات کو صدق دل اور کیفیت داخلی سے مربوط کرتے ہیں۔ ناصر کاظمی کی طرح وہ بھی داخلی کیفیات کو خارجی عوامل سے جوڑنے کا ہنر جانتے ہیں۔ مجید امجد کے ہاں نازک خیالی و تازہ کاری بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ تلخ سے تلخ زندگی کے حقائق کو بھی بڑی آسانی سے بیان کرنے کا ڈھنگ موجود ہے۔ آخر میں ان کا ایک خوبصورت شعر دیکھیے:

میں روز ادھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے
میں جب ادھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا

☆☆☆☆☆

بلاعنوان

زبان گوشت کا ایک لوتھڑا، نہ حسن، نہ دلکشی اور اس پہ یہ غرور بے جا!!! ٹیٹری کی سی خوش گمانی گویا آسمان تھام رکھا ہو۔'' کان نے آنکھ سے گویا دبی دبی سرگوشی میں شکایت کی۔ آنکھ نے یہ سرگوشی دیکھ تو لی لیکن اسے فوری طور پر جواب دینے کی فرصت نہ تھی۔ وہ سطحی مناظر کی جانچ میں گم تھی۔ اکثر ایسا ہی ہوتا کہ آنکھ حقیقی تصویر سے منہ موڑے چمکتے دمکتے دلفریب مناظر میں کھوئی رہتی۔ ابھی بھی پردہ چشم کے سامنے ایک منحنی سا لاغر لڑکا پچکے گال اور کالے سیاہ ہونٹ کے ساتھ سٹاپ پر کھڑی لڑکی کے سینے پر ہاتھ مار کر آگے بڑھ چکا تھا۔ لڑکی یک دم ہڑبڑائی اور سہمی نظروں سے زمین پر نادیدہ خدا ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے چہرے پر سراسیمگی پھیل چکی تھی جس نے چہرے کی چمک کو کھا لیا تھا۔ چہروں کی چمک کھانا ویسے بھی ہر دور میں آسان ترین ہدف رہا ہے۔ لڑکا تھوڑی دور اب ایک کھمبے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی وحشت تھی۔ مردہ لڑکی کو بھنبھوڑنے کے بعد زندہ سینے کی دھڑکن اس کے اندر بھانبھڑ مچا رہی تھی۔ بزدلی کے آخری جنون میں کھمبے کو نزاکت و لطافت سے بھرپور جوبن تصور کرنا معجون کی سی طاقت دے رہا تھا۔ ایسے مناظر کی بہتات تھی اور آنکھ ان سے سرسری گزرتی کان کی سرگوشی پر متوجہ ہوئی۔ کتنے رنگ تھے اس کے اندر..... سامنے سے گول کچھ ابھری ہوئی، استخوانی حلقہ میں رکھی گئی چشم میں مکاں سے لامکانی کے بے شمار اور بیش بہا امکانات موجود تھے۔ تین تہوں، ہزاروں رگوں اور ایک انچ سے بھی کم قطر پر مشتمل آنکھ جہان سامری اور لاتعداد خوابوں پر ہی مشتمل نہ تھی، اس کے اختیارات بھی لامحدود تھے۔ چاہتی تو سمندر بن جاتی... اور کبھی دشت کی وحشت سمیٹ

سعدیہ بشیر

لیتی۔ فلک کی وسعت اس کے سامنے کینوس ہوسکتی تھی اگر وہ تاروں کی مانگے کی چمک میں نہ الجھتی۔

پارکا ہر منظر اس پر کھل سکتا تھا۔ نادیدہ جہان کے اسرار اس کی ایک جست سے بھی کم فاصلے پر تھے۔ محبوب کے دل کے سوا اس کی رسائی ہر جگہ ممکن تھی لیکن اکثر پکسلز پھٹ جایا کرتی تھیں۔

کیونکہ ہوا میں آنکھ کھلتے ہی روشنی قرنی چشم یا آنکھ کے شفاف پردے سے ٹکراتی ہی منتشر ہونے لگتی ہے۔ ہوا سے زیادہ کثیف اور گھنی ہونے کی وجہ سے ارتکاز رہ نہیں پاتا۔

پوش پوٹے جن کی حرکت پر روشنی کی آمد کا انحصار ہے، ظاہری روشنی سے تمام مناظر کی شکلیں چشم حیرت میں انڈیل رہے تھے جہاں سے دماغ کو جانے والا راستہ تھا۔ دماغ کے سٹور میں کتنے ہی فلٹر، نیگیٹو اور تصاویر بکھری پڑی تھیں جن میں ہزار ہا تصاویر کا تو کوئی مصرف ہی نہ تھا۔ یہ مناظر چاہتے تو آنکھ کی سب سے بیرونی تہ پر ہی قیام پذیر رہتے یا پھر پریڈ کی طرح گزرتے چلے جاتے۔ پپوٹوں کو اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ مسلسل کام سے جب وہ تھکنے لگتے تو خود بخود ڈھلکنے لگتے تھے۔

ایسے عالم میں آنکھ پر خوابوں کی برف باری ہوتی تو کبھی شرارے سلگنے لگتے اور خوف کی لہر دماغ تک رینگتی چلی جاتی۔

آنکھ کے دو دروازے تھے ایک وہ جو اندر کھلتا تو اناالحق کی صدا بن جاتا لیکن اس پر مصلحت کے ریشمی پردے لٹکے ہوئے تھے۔ باہر کا دروازہ البتہ ہر وقت کھلا ہی رہتا تھا۔ یہاں کوئی واک تھرو گیٹ نہیں تھا، نہ ہی کارڈ اور نمبر چیک کیے جاتے تھے۔ بس آنکھ کی پتلی لاتعلقی سے سب کو آتے جاتے دیکھتی۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ کسی کا نقش ٹھہر جاتا۔ رقص کرتا، ادائیں دکھاتا اور استحقاق سے دل کے کواڑ دھکیل کر نہ صرف اندر داخل ہوتا بلکہ مستقل قیام پذیر بھی رہتا ایسا ہزاروں سالوں میں نرگس کی بے نوری کے بعد ہی کہیں ہوتا اور دل کے چمن میں دیدہ ور کی جھلک ابھرتی۔

زبان بھی تو زیادہ تر آنکھ کو بیرونی مناظر کی کہانیاں سنا کر محدود رکھنے کی کوشش کرتی اور کافی سے زیادہ حد تک کامیاب بھی رہتی۔

زبان کے سو بہروپ تھے۔ چرب زبانی۔ بے باکی، شوخی، درازی بیان۔ دشنام گوئی۔ حلاوت، ظرافت، شگفتگی، خوش گفتاری، شیرینی، چاپلوسی، تیزی وطراری اور خاموشی بہ معنی طراز .....

کان کی شکایتی سرگوشی پھیل رہی تھی اور سمٹنے کو دور جدید میں اقدار کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ آنکھ اگر بولتی تو کوئی مقرر اس کی تاب نہ لاسکتا تھا اور خموشی کی زبان سمجھنے کا علم

ہر دور میں ہی متروک رہا ہے۔ آنکھ کی پتلی جتنا بھی پھیلتی، زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ آنکھ کی خوب صورتی و تحیر اور ندامت سب زبان کے سامنے بے بس تھے۔ کان تو دو تھے لیکن آنکھ دو ہو کر بھی ایک ہی تھی.. دل جیتنے کے ہنر سے ناواقف.....

اور دل اس کے تو ہزار در بیچے تھے۔ ہر در بچہ کو دھوپ روشنی اور ہوا کی ضرورت.....دل کی اپنی شعبدہ بازیاں تھیں۔ کبوتر، فاختہ چڑیا اور کتنے ہی معصوم پرندے وحشی درندوں کے ساتھ خوشی خوشی آباد تھے۔

چار خانوں میں بٹی دل کی سلطنت جتنی مضبوط تھی اتنی ہی کمزور بھی...

ذرا سے دھچکے اور فشار پر پورا نظام ہل جاتا.. تمام جسم کو دل سے بہت سی ان کہی شکایات تھیں۔ وہ سب دل کی نازک مزاجی سے خفا تھے یہ کیا کہ دل کی گرانی سب پر آفت بن کر ٹوٹتی اور دل کی سرشاری آنکھوں کی نیند اڑا دیتی اور سارے جسم پر اس کے اثرات کیا کچھ ستم نہیں ڈھاتے تھے۔

دل کی ہزار خواہشیں اور ہزار کہانیاں تھیں۔ دل عالم کے رنگوں کا گواہ تھا اور خود میں ڈوب کر بادشاہ بن سکتا تھا لیکن اسے تو لو بھ لے بیٹھا۔ مسکان سے خوف زدہ خواہشیں آلودگی کے ملبے پر بیٹھی زار زار ہنس رہی تھیں۔ دل کبھی تو آنکھ کو ٹھیرنے کا حکم دیتا اور کبھی بے نیازی کی صورت بند رہنے کی صلاح دیتا.. اس کے باوجود دل آنکھ کا غلام بھی تھا۔ اس کے اندر کی آنکھ بھی تو بند تھی اور دروازہ بھی ..... درحقیقت تمام اعضا کی سلامتی کا دارومدار آنکھ کی شفافیت اور زبان کی دیانت پر تھا .....ہمیشہ سے ہی گڑھا کھودنے میں آنکھ اور زبان کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ یہ گڑھے اتنے تھے کہ کبھی بھرتے ہی نہ تھے۔ زبانی جمع خرچ پہ نقصان کا اندیشہ نہ تھا لیکن نقصان تند و تیز سیلاب کی صورت روح کو کچل کر وصولی کر لیتا۔ آنکھ کی عدم توجہی اور بسا اوقات زیادہ توجہ سے دل کے اضمحلال میں اضافہ ہی ہوتا۔ باقی سب کچھ نارمل نظر آتا۔ اعضا میں راہ و رسم تو تھی لیکن خلوص کی لو دھیرے دھیرے بجھتی جا رہی تھی۔ وہ سب ایک رسی سے بندھے تھے لیکن ان کے مقاصد اور اطراف جدا جدا .....اسی لیے وہ سطح آب کے مناظر سے آگے نہ بڑھ سکتے تھے۔ آنکھ کی اوپری سطح گیلی ہوتی تو دل چپ سادھ لیتا اور دل سوختہ سامانی میں بلکتا تو آنکھ بے نیاز نظر آتی۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ دل میں طغیانی آتی تو آنکھ میں سیلاب بہہ نکلتا۔ آنکھ پر یہ عالم طاری ہوتا تو زبان بھی کچھ نہ پھوٹتی۔ ایسا نہ تھا کہ دل کی چیخیں خاموش تھیں لیکن کان جیسے بہرے ہو جاتے۔ ایک کان

سے دوسرے کان تک کے سفر میں دماغ ہل کر رہ جاتا۔ یہ اثرات سیاسی داؤ پیچ جانتے تھے۔ سب اچھا ہے کی تکرار تبھی کھلتی جب ٹیسٹ کی رپورٹس موصول ہوتیں تو دل کی گہما گہمی چپ سادھ لیتی۔ اسے یہ بوجھ آخر تک ڈھونا تھا۔

ساری آزادی کے باوجود دل میں اتنی عقل ہی کہاں تھی..... اور چلا تھا کاروبار سلطنت چلانے...

دل ہمکتا، مچلتا، روتا، چیختا لیکن اس پر کسی ساحر کی بندش تھی اسے اپنے آپ کو سنبھالنا ہی پڑتا۔ دل درویش بھی تھا۔ گداگر بھی۔ شاہ بھی۔ لٹیرا بھی۔ سو بہروپ تھے۔ لاکھ طغیانیاں اٹھتیں۔ تاراج کر جاتیں..... آنکھ کی کمزوری نظر آتی تھی تو مصنوعی آئینہ خانے کے عدسوں سے مدد لی جاتی۔ دل کی کم زوری اور ٹوٹ پھوٹ کو بھی نالیوں سے باندھ دیا جاتا۔ جھٹکے دے کر چلنے پر مجبور کیا جاتا۔ روحانی علاج کی شعبدہ بازیاں عروج پہ تھیں لیکن علاج ندارد..... دل کی ویرانی مندر مسجد گرجا سب کی ویرانی سے بڑھ کر تھی ..... جلتا، بجھتا ..... طواف آرزو میں ہلکان ..... بے حال ..... بدحال لیکن حال کا امین ..... ماضی کی یاد کی گٹھڑی سمیٹے۔ اندیشوں کی رمل کاریوں سے لرزتا چلے جا رہا تھا۔ سفاک زندگی کی امانت سنبھالے دل پر جو گزرتی تھی اس کا بیان آج تک ادھورا ہے۔ اس کا ذکر میر و غالب سے پوچھیے ..... ہائے ہائے کے تیر تفنگ ..... لپٹتے لپٹاتے دل آنکھ کی کور چشمی سے جھانکتا چلے جاتا اور آنکھ بجھتی جلتی دل کو سنبھالنے اور دل کی خبریں چھپانے میں ہلکان رہتی ..... آنکھ اور دل کے تماشے میں تماش بینی کا کام دیگر اعضا کے سپرد تھا۔ آخر کار ان تمام جذبات کو سپرد خاک ہونا تھا۔

دور جدید میں آنکھ دجالی ہو چکی تھی۔ گویا ایک آنکھ میں ضعف بصارت کے مسائل لاینحل تو ہیں ہی لیکن دوسری آنکھ کی رنگا رنگی اور توہم نے دھندلے مناظر کی تفہیم کے راستے میں دلدل پیدا کر دی ہے۔ اس دلدلی زمین پر دجالی آنکھ نے دعوت گلگشت دے رکھی ہے۔ سو دل آنکھ کے تعاقب میں اور آنکھ دل کے تابع، کان سماعت کی بجھارتوں سے بے نیاز۔ زبان کو مائیک نے اپنے حلقہ ارادت میں لے لیا تھا۔ انسان اپنے اعضا سے کام لے کر بھی محتاج تھا۔ اس کے سامنے راستہ تھا لیکن اعضائے رئیسہ مضمحل تھے۔ مصنوعی پن کی آزادی کا دور مظاہر کی حقیقت پر سانپ بن کر پھنکار رہا تھا۔ مثل سرمارگنج اور سب اپنے سے خوف زدہ دبکے بیٹھے ہیں۔

☆☆☆☆☆

کھٹے میٹھے بول

ناصر نقوی

یہ روئیداد ہے اس مزاحیہ مشاعرے کی ریکارڈنگ ''کھٹے میٹھے بول'' کی جس کی میزبانی کے فرائض محترمہ بشریٰ رحمٰن صاحبہ نے انجام دیئے تھے۔ عمران منظور صاحب نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کاش اسے ایک مرتبہ پھر پی۔ٹی۔وی دکھا دے۔ لیکن یہ ریکارڈنگ این۔ٹی۔ایم کے لیے کی گئی تھی اور جب وہ ادارہ دوستوں کی بداعتمادی کی نذر ہوا تو اس کا تمام ریکارڈ پروگرام ہی نہیں، سارا سامان بھی ذمہ داران لوٹ کر لے گئے۔ اس لیے دوبارہ کی امید نہیں کی جا سکتی تاہم اس یادگار مشاعرے کی ریکارڈنگ شخصیات کے علاوہ بھی دلچسپ ہے، اس لیے ''یاد ماضی'' حوالہ تحریر کر رہا ہوں۔

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ بے ادب ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ ادبی حلقوں میں پذیرائی پائی، شاید یہ فیض ہے ان ادبی شخصیات کا جن کا قرب الحمدللہ مجھے حاصل رہا، برسوں پہلے کی بات ہے کہ بھارتی ٹی وی تواتر سے مزاحیہ مشاعروں کا اہتمام کیا کرتے تھے لیکن ہمارے ہاں ایسا رواج نہ تھا۔ ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت

سے ہماری ''رگ مزاح'' پھڑکی کہ ہمارے ہاں بھی میدان طنز و مزاح میں کمی نہیں، کیوں نا انہیں اکٹھا کر کے کوئی محفل جمائی جائے۔ اس وقت پی ٹی وی کی بادشاہت تھی لیکن ''این۔ٹی۔ایم'' جیسے نیم سرکاری ٹی وی چینل نے جنم لے لیا تھا۔ تاہم کبھی کبھار ضمیر جعفری، انور مسعود وغیرہ پی ٹی وی کے پروگراموں میں بطور مہمان پھلجھڑیاں چھوڑتے نظر آتے تھے۔ این۔ٹی۔ایم کو ''آئیڈیا'' دیا تو تاجدار عالم نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ معاہدہ ہمارے دوست یاسین ملک سے طے ہوا کیونکہ وہ ''ہم نوالہ ہم پیالہ'' تھے۔ مزدوری ہم نے کی۔ مقصد یہی تھا کہ کچھ نیا کر گزریں، پہلے مزاحیہ مشاعرہ ریکارڈ کیا، پسندیدگی کی سند ملی تو اسے مہمانوں کے جھرمٹ میں ریکارڈ کیا اور پذیرائی ملی تو مختلف اداکاروں سے مزاحیہ کلام پڑھوالیا پھر تاجدار عالم کی تجویز پر ایک مزاحیہ مشاعرہ ''روپ بہروپ'' بھی کر ڈالا۔ اس پروگرام کی خوبصورتی یہ تھی کہ عطاالحق قاسمی، امجد اسلام امجد، مظفر وارثی، اصغر ندیم سید، بسمل صابری جیسے شعراء اکرام سامنے بیٹھے تھے اور ان کے مشہور و معروف کلام کی پیروڈی منور سعید، البیلا، جاوید رضوی، پرویز رضا اور راقم سٹیج سے کر رہے تھے۔ لہٰذا سامعین میں بیٹھے ممتاز شعراء اپنے اپنے ہمزاد کے روپ میں دیکھ کر زبردست داد دیتے رہے۔ یہ تجربہ بھی بہت کامیاب رہا اور اس کوشش سے یہ روایت پڑ گئی کہ ہر خاص موقعے پر این۔ٹی۔ایم کے لیے ''مزاحیہ مشاعرہ'' فرمائش پر ریکارڈ کیا جاتا، بعد ازاں یہ سلسلہ پی ٹی وی، پرائم ٹی وی اور اے ٹی وی پر بھی جاری رہا اور ہم نے درجنوں مزاحیہ مشاعرے کرائے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے حالانکہ سنجیدہ شاعر برادری اس کام سے زیادہ خوش نہیں، کیونکہ وہ اس قسم کے مشاعروں کو سرکس اور جوکر تماشا سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

اب سنیے اس ''کھٹے میٹھے بول'' کی ریکارڈنگ کا قصہ، جسے ہم نے جناب ضمیر جعفری کی صدارت میں ریکارڈ کیا۔ اس میں پہلی اور آخری مرتبہ جناب قتیل شفائی اور کلیم عثمانی نے اپنی غزلوں کی خود پیروڈی کر کے داد حاصل کی۔ اسی مشاعرے کی میزبان محترمہ بشریٰ رحمان تھیں اور شرکاء میں انور مسعود، سرفراز شاہد، انعام الحق جاوید، خالد مسعود، عبیر ابوذری، زاہد فخری اور ان لوگوں کے دیگر ہمعصر شامل تھے۔ ہم نے کوئنز روڈ پر ایک خوبصورت شادی ہال کی بکنگ کرائی، دعوت نامے بھی بڑی تعداد میں جاری کیے جس پر جلی الفاظ میں تحریر کیا کہ مشاعرے کی ریکارڈنگ ٹی وی سکرین کی زینت بنے گی لہٰذا فیملی کے ساتھ مکمل تیاری سے تشریف لائیں، ہم آپ کا

استقبال کریں گے۔ پورا ہفتہ سیٹ ڈیزائن اور ہال کو ریکارڈنگ کی ضرورت کے مطابق سجایا گیا، اتوار کا دن تھا اس لیے وقت بھی لوگوں کی عادت کے مطابق دس بجے کے بجائے 12 بجے رکھا گیا تاکہ تاخیر سے اٹھنے والے بھی تفریح کے موڈ میں آ سکیں۔ زبردست ''ہائی ٹی'' کا بندوبست بھی کیا تاکہ ناشتے کے بغیر آنے والوں کی بھی ''اشک شوئی'' ہو سکے۔ اسلام آباد سے جناب ضمیر جعفری، انور مسعود اور سرفراز شاہد نے اکٹھے آنا تھا ان کی سہولت کے لیے ہم نے نیشنل ہوٹل ایبٹ روڈ پر انتظام کیا تھا تاکہ ناشتے اور تیاری کے بعد ''شادی ہال'' پر ریکارڈنگ کے لیے جائیں تو وہ لوگ ''فریش'' ہوں - ہمارے چوتھے اسلام آبادی مہمان ڈاکٹر انعام الحق جاوید تھے وہ ہمارے محترم استاد انجم رومانی کے داماد ہیں اس لیے وہ ایک دن پہلے سسرالی ہو چکے تھے زمانہ ''ڈائیوو'' کا دور نہیں تھا اور نہ ہی موبائل بیماری پھیلی تھی۔ اس وقت کا موبائل صرف ''پجارو'' والے مالکان، سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کے پاس ہوا کرتا تھا لیکن ہاتھ سے دور کسی ملازم کے پاس کیونکہ آج کے مقابلے میں خاصا بھاری بھرکم تھا۔ آج لوگ ماشاء اللہ ایک سے زیادہ موبائل اٹھائے پھرتے ہیں کسی کو کوئی عار نہیں، ہم وقت مقررہ پر فلائنگ کوچ کے سٹینڈ پر پہنچ گئے۔ سب سے پہلے سرفراز شاہد نمودار ہوئے۔ پھر انور مسعود کا دیدار ہوا اور آخر میں ضمیر جعفری۔ تینوں نامور شخصیات کی ڈرائیوری پر بہت خوش تھا۔ گاڑی میں ادب سے بٹھایا اگلی نشست پر جعفری صاحب، انور مسعود اور سرفراز شاہد پچھلی نشست پر تھے، میں ابھی حال احوال اور سفر کی کہانی سننے کے موڈ میں تھا کہ بات کاٹتے ہوئے ضمیر جعفری صاحب بولے ''ہوٹل کیسا ہے؟''

میرا جواب تھا ''بہترین''۔

فرمانے لگے ''آپ نے وہاں پہنچ کر میرا ایک کام کرنا ہے؟''

میں نے کہا ''آپ فکر نہ کریں''

تھوڑی دیر میں ہم لوگ ہوٹل پہنچ گئے۔ میں نے پوچھا ''ناشتہ کیسا کریں گے آپ لوگ، لاہوری یا انگریزی؟''

سرفراز شاہد صاحب بولے ''ہمیں لاہوری ناشتہ کرا کے کسی چکر میں نہ ڈال دینا، سادہ لوگ ہیں عام ڈبل روٹی اور انڈہ چائے چلے گی۔''

میں بولا ''تکلف نہیں، ہوٹل کے علاوہ بھی ناشتہ مل سکتا ہے۔''

ضمیر جعفری صاحب نے ہنستے ہوئے کہا ''مثلاً؟''

میں نے ایک مستند ویٹر کی طرح سبق سنایا، نان چنے، چھوٹے بڑے پائے، بونگ، انڈہ

کوفتہ، دودھ دہی کی لسی، پیڑے والی لسی، چائے، کشمیری چائے، سب کچھ مل سکتا ہے۔
انور مسعود صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ''عام لوگ، عام ناشتہ، البتہ یہ پیڑے والی لسی ٹرائی کی جاسکتی ہے۔''
میں بولا ''جناب آپ عام لوگ ہرگز نہیں، خاص بلکہ اہم ترین لوگ ہیں۔ آپ کی خدمت بطور میزبان میرا فرض ہے لیکن پیڑے والی لسی کا رسک نہیں لے سکتا۔
انور مسعود صاحب بولے ''کیوں؟''
اسے ہضم کرنا ہر کسی کی بات نہیں، یہ تو اکثر نوجوانوں کا پیٹ خراب کر دیتی ہے اور آپ لوگ تو ..... سرفراز شاہد نے لقمہ دیا ''نقوی صاحب'' ہماری جوانی پر اعتراض نہ کریں ''جعفری صاحب'' جوان اکبر ہیں۔
سب نے ایک مشترکہ قہقہہ لگایا لیکن جعفری صاحب ''سائیڈ ٹیبل'' پر پڑے فون سے کھیلتے کھیلتے بولے ''یہ کیسا بہترین ہوٹل ہے؟ ایکسچینج آپریٹر فون نہیں سن رہا؟؟؟''
میں نے کہا ''میں دیکھتا ہوں، کوئی بہت ضروری فون ہے؟''
جعفری صاحب سنجیدہ لہجے میں بولے ''عجیب آدمی ہیں فون ضروری ہی ہوتا ہے۔''
سرفراز شاہد صاحب نے بات آگے بڑھائی ''نقوی'' صاحب آپ کو احساس ہی نہیں آپ کی سوچ سے بھی زیادہ ضروری ہے وہ

بظاہر سنجیدہ تھے لیکن ان کی آنکھیں اور چہرہ چغلی کھا رہے تھے کہ وہ جیسے جانتے ہیں کہ فون کسے کرنا ہے اور کتنا ضروری ہے۔
میں بولا ''ناشتے'' کا آرڈر دے کر پتہ کرتا ہوں۔
جعفری صاحب کہنے لگے، ناشتہ بھی ہو جائے گا، اگر فون ہو جاتا تو آرام سے ناشتہ کرتے رہتے ایسے ہی ذہن فون میں لگا رہے گا۔
میں نے فون کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے انکوائری سے رابطہ کیا، جواب ملا ''سر۔ آج اتوار ہے عام طور پر لوگ دیر سے اٹھتے ہیں اس لیے آپریٹر بھی کبھی کبھار ''لیٹ'' ہو جاتا ہے۔''
جعفری صاحب ناراضگی سے بولے ''اچھا بہترین ہوٹل ہے اگر کسی کو ایمرجنسی ہو تو فون کیسے کرے گا؟''
میں شرمندگی سے اٹھا اور میں نے انکوائری پر خود جا کر کہا ''یار ایمرجنسی'' ہے اور آپ کا آپریٹر نہیں، فون کیسے کیا جائے؟''
اس نے کہا ''سر کمرہ نمبر بتائیں، میں ملا دیتا ہوں''۔
میں نے نمبر بتایا اور اس نے فوراً کال ملا دی اس کامیابی پر میں جلدی سے فاتحانہ انداز میں کمرے میں داخل ہوا تو ضمیر جعفری صاحب چہک چہک کر محو گفتگو تھے، ان کا گول چہرہ بھی ''سرخ گلاب'' کی طرح

دونوں صاحب سے منفرد تھا۔ مجھے سرفراز شاہد نے اشاروں اشاروں میں خاموش اور باادب رہنے کا کہا، لیکن ان کے چہرے کی شوخی قابل دید تھی، میں بھی انور مسعود صاحب کے ساتھ خاموش بیٹھ گیا۔ تقریباً دس سے پندرہ منٹ کی اس کال میں جعفری صاحب اپنے مخاطب کو بتا رہے تھے کہ میں لاہور پہنچ گیا ہوں۔ تمہیں بتایا اس لیے نہیں کہ سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ ایک مشاعرے میں آیا ہوں شام کو ملاقات کروں گا۔ کھانا بھی اکٹھا کھائیں گے لیکن اپنے ہاتھوں سے کریلے گوشت بنانا، ان الفاظ پر میرے کان کھڑے ہوئے تو سرفراز شاہد نے پھر اشارہ کیا ''بولنا نہیں'' خاموش۔ میں سمجھا کسی بہو بیٹی سے بات کر رہے ہیں۔

فون ختم ہوا، خدا حافظ کہنے کے بعد جعفری صاحب نے ایک ''آہ'' بھری یعنی لمبا سانس لیا اور بولے ''واہ نقوی صاحب آپ نے بڑی ذمہ داری نبھائی، اب میں سکون سے پہلے ''فریش'' ہوں گا پھر ناشتہ کروں گا۔ اگر آپ کوشش نہ کرتے تو ''آپریٹر'' ہمیں دھوکہ دے گیا تھا اور ہم یونہی آپ کے قیدی بنے رہتے، اب بندوبست ہو گیا۔ شام کی فکر مت کیجیے گا مشاعرے کے بعد میں نے ایک عزیزہ کی طرف جانا ہے گاڑی آ جائے گی مجھے لینے کے لیے، بہت شکریہ، اور وہ ''باتھ روم'' چلے گئے۔

سرفراز شاہد نے انور مسعود کو آنکھوں آنکھوں میں بتا دیا کہ جعفری صاحب اب خوش ہیں۔ ان کا انرجی لیول بڑھ گیا ہے۔ مشاعرہ بڑا زبردست ہو گا۔ انور صاحب نے بھی اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھمائیں اور مثبت انداز میں جواب دیا کہ سرفراز شاہد درست فرما رہے ہیں۔

پھر بھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو سرفراز شاہد دبے پاؤں میرے قریب آ کر بولے ''آپ جانتے ہیں کہ جعفری صاحب نے کس کو فون کیا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

آہستہ سے بولے ''بشریٰ رحمٰن'' ___ آج کل جعفری صاحب کی ان سے گاڑی چھن رہی ہے۔ دیکھا نہیں آپ نے فون کے بعد کتنی ''انرجی'' آ گئی ہے ان میں..... پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے ''کیسی خبر دی ہے میں نے آپ کو؟''

میری ہنسی چھوٹ گئی۔

بولے ''کیا ہوا؟''

میں نے کہا ''جناب بڑی خبر تو میرے پاس ہے'' ''بریکنگ نیوز''

کہنے لگے ''وہ کیا؟''

میں نے ان کے کان میں کہا ''بشریٰ رحمٰن'' ہمارے مشاعرے کی میزبان ہیں''۔

زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے سرفراز شاہد نے

یہ خبر انور مسعود صاحب کے گوش گزار بھی کردی۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے بولے ''واہ___ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو''

سرفراز شاہد اور انور مسعود اس صورت حال سے بہت محظوظ ہوئے اور انہوں نے مجھے پابند کیا کہ آپ جعفری صاحب کے سامنے یہ مت بتایئے گا ''بڑا مزہ آئے گا''۔ ہم تینوں ہنس رہے تھے کہ حضرت صاحب واپس آ گئے۔

بولے ''یہ بڑا مزہ آئے گا'' والی کیا بات ہے۔ ہمیں بھی بتاؤ کہ خود ہی مزے لیتے رہو گے؟

انور مسعود بولے ''یہ بچوں والی بات ہے آپ کے مطلب کی نہیں'' سب نے زور دار قہقہہ لگایا تو جعفری صاحب کہنے لگے ''ہمیں بھی بچہ ہی سمجھ لو''۔

سرفراز شاہد نے بات بدلتے ہوئے کہا ''نقوی صاحب نے لطیفہ سنایا تھا جو ہم آپ کے احترام میں نہیں سنا سکتے۔''

جعفری صاحب نے مجھے گھور کر دیکھا اور عجیب سا منہ بنایا جیسے میں نے "Below the Belt" کوئی بات کی ہو۔

اتنے میں ناشتہ آ گیا، معاملہ گول ہو گیا، میں نے صرف چائے پی اور شادی ہال کے انتظامات دیکھنے کے لیے نکل پڑا، مہمانوں سے کہا آپ لوگ دو گھنٹے آرام کریں پھر آپ کو ''جائے وقوعہ'' پر لے جائیں گے۔

سرفراز شاہد نے ''جائے وقوعہ'' کو انجوائے کیا اور تالیوں میں ہمیں رخصت کرتے ہوئے فرمایا ''واہ جائے وقوعہ''۔۔

انور مسعود بولے ''نہیں جائے وقوعہ نہیں'' جائے واردات___ ہم تینوں نے پھر قہقہہ لگایا۔

جعفری صاحب نے پھر گھور کر دیکھا اور بولے ''ایسی کون سی بات ہے کہ مجھ سے پردہ داری ہے؟''

سرفراز شاہد نے چالاکی سے مسکراتے ہوئے کہا ''حضور بات آپ اپنی ہی سمجھیں لیکن ہمیں محظوظ تو ہونے دیں؟''

جعفری صاحب نے ناگوار انداز میں ''لاحول'' پڑھ دیا اور ہم ہنستے ہوئے وہاں سے غائب ہو گئے۔

شادی ہال پہنچا تو وہاں ہماری ٹیکنیکل ٹیم کیمرہ مین اجمل حسین کی قیادت میں اپنے انتظامات میں مصروف تھی۔

میں نے کہا ''ویری گڈ''___ جلدی جلدی کام مکمل کریں، سامعین کی آمد سے پہلے تیاری مکمل ہونی چاہیے کیونکہ مہمانوں کی موجودگی میں بھاگ دوڑ اچھی نہیں لگتی۔۔۔

اجمل صاحب نے یقین دہانی کرائی کہ صرف آدھا گھنٹہ چاہیے تمام کیمرے لگ گئے ہیں صرف لائٹنگ ایڈجسٹ کرنی ہے۔

پھر بولے "آپ کے شعراء اکرام اور مہمان سامعین کب آئیں گے؟"

میں نے جواب دیا "اتوار کا دن ہے، لوگوں کی چھٹی ضائع نہ ہو، ہم نے کم از کم وقت میں ریکارڈنگ مکمل کرنی ہے اس لیے کہ خوبصورت محفل بھی تاخیر کا شکار ہو جائے تو "بوریت" ہوتی ہے۔

اجمل صاحب بولے "جناب تین کیمرے سٹیج کے لیے اور دو کیمرے سامعین پر ہوں گے۔ سامعین کا موڈ دیکھ کر ہم ان کے شارٹس کے لیے سٹیج والے کیمرے بھی سامعین کے لیے استعمال کر لیں گے آپ فکر نہ کریں۔

میں مطمئن ہو گیا، ہال انتظامیہ کی تلاشی بھی لی کہ انہوں نے مہمانوں کی خاطر تواضع کے مناسب انتظام کر لیے کہ نہیں، امید تھی بھاری بھرکم ممتاز شعراء کے باعث سامعین کی تعداد بھی زیادہ ہوگی۔ یقیناً چھٹی کو لوگ انجوائے کرنے اپنی فیملیز کے ساتھ آئیں گے مہمان شعراء کی "ہائی ٹی" کا علیحدہ بندوبست کیا گیا تھا۔

پھر ہوا کیا؟ مقررہ وقت پر شعراء اکرام آنا شروع ہوئے لیکن سامعین غائب تھے۔ ہوٹل سے بار بار فون آئے کہ آپ ہمیں بھول تو نہیں گئے۔ مختلف بہانوں سے تاخیر کی کہ تھوڑے بہت لوگ آ جائیں تو ریکارڈنگ شروع کریں گے ۔ اجمل صاحب سے مشاورت کی، کم لوگوں کی موجودگی میں کیسے گزارا کریں گے۔ تھوڑا وقت اور گزرا سامعین نہیں آنے تھے نہیں آئے، پھر اجمل صاحب سے مشورہ کیا کہ بغیر سامعین کے ریکارڈنگ کس انداز میں کریں گے۔

ان کا کہنا تھا تمام شعراء کو ایک دوسرے کو زبردست داد دینے کا پابند کیا جائے تاکہ مشاعرے کا ماحول بن جائے، میں نے ہوٹل گاڑی بھجوا دی لیکن سامعین کی بے حسی پر بے حد پریشان تھا، جو شعراء آ چکے تھے پھر وہ تاخیر کی وجوہات پوچھنے لگے۔ پہلے بشریٰ رحمٰن کی آمد کا بہانہ لگایا، حالانکہ وہ آنے کو تیار تھیں ہم نے انہیں روک رکھا تھا، پھر ضمیر جعفری اور انور مسعود وغیرہ کے انتظار کی بات کی۔ قتیل شفائی، کلیم عثمانی اور بابا نجمی ابو ذری کا اصرار تھا جلدی شروع کریں ہم مہمانوں کا چانس لے رہے تھے اسی پریشان میں کھڑا تھا کہ پی ٹی وی کی ٹیلی فون آپریٹر ریحانہ سامنے سے آ گئیں۔ میں نے بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا ان کے ساتھ پوری فیملی تھی، میری خوشی پر چہک کر بولیں آپ کدھر؟

میں نے جواب دیا "جدھر آپ"

بولیں "میرے کزن کا نکاح ہے لیکن آپ کدھر سے ہیں"

کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ بولا ''میں سمجھا آپ ہماری ریکارڈنگ کے لیے آئی ہیں؟''

کہنے لگیں ''کیسی ریکارڈنگ؟''

میں نے کہا ''ہم مزاحیہ مشاعرہ ریکارڈ کر رہے ہیں این۔ٹی۔ایم کے لیے لیکن ایک مہمان بھی نہیں آیا، آپ لوگوں کو دیکھ کر حوصلہ ہوا تھا۔ ''تمام شعراء موجود ہیں سننے والا کوئی نہیں۔''

بولیں ''پریشان نہ ہوں، میں کچھ کرتی ہوں''

''آپ کیا کریں گی؟''

بولیں اگر لڑکے والے لیٹ ہوئے تو میں مہمانوں کو اوپر لے آؤں گی'' وہ یہ کہہ کر ہال میں چلیں گئیں۔

مجھے کچھ حوصلہ ہوا لیکن پریشانی کم نہیں ہوئی، ابھی اپنی بے بسی کا ماتم ہی کر رہا تھا کہ ریحانہ دوبارہ آ گئیں۔

کہنے لگیں ''آپ کا کام کتنی دیر میں ہو جائے گا'' میں نے مہمانوں کو رضامند کر لیا ہے۔

میرا چہرہ خوشی سے کھل گیا، چند لمحوں کے وقفے سے جواب دیا ''زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ، آدھے گھنٹے میں بھی کام چل جائے گا۔

کہنے لگیں ''آپ انتظامات مکمل کر کے ہمیں بتا دیں، مہمان آ جائیں گے۔''

میں نے ساری کہانی اجمل صاحب کو سناتے ہوئے بتایا کہ سامعین ادھار آ رہے ہیں۔ اس لیے مشاعرہ شروع ہوتے ہی ''کلوز ورک'' جلد از جلد مکمل کر لیا جائے۔

اسی دوران ضمیر جعفری وغیرہ بھی تشریف لے آئے، بشریٰ رحمٰن پہلے ہی پہنچ چکی تھیں، دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو حیرانی اور پریشانی قابل دید تھی، ہم نے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریکارڈنگ کا فیصلہ کیا، شعراء اکرام کو بھی بتا دیا کہ وہ بھی ''وقت کم مقابلہ سخت'' کا فارمولا اپنائیں۔ کلام اس انداز میں پڑھیں کہ ادھار آنے والے سامعین انجوائے کریں اور شادی بھول جائیں۔ فوراً ریحانہ صاحبہ کو پیغام بھیجا اور چند لمحوں میں زرق برق لباس میں ملبوس مہمانوں سے ہال بھر گیا۔ بشریٰ رحمٰن نے اپنے کلام سے آغاز کیا اور اپنی ناموری اور خوبصورت کلام سے چھا گئیں۔ محفل مشاعرہ کم اور عید میلہ زیادہ لگ رہا تھا۔ باری باری تمام شعراء آتے رہے اور داد حاصل کرتے رہے۔ سب کا ''انرجی لیول'' خوبصورت محفل کے باعث بڑھا ہوا تھا۔ سب ایک سے بڑھ کے ایک تھے۔ قہقہوں اور تالیوں سے ہال گونج رہا تھا یوں سمجھئے ''مشاعرے'' کا ''ٹ'' تھا لیکن عروج انتہا کا تھا۔ اچانک سیڑھیوں سے ایک باریش بزرگ ہال میں داخل ہوئے اور انہوں نے نعرہ لگایا ''شرم کرو، منڈے والے آ گئے

نہیں، سب تھلے چلو"

ہال میں سناٹا چھا گیا، زاہد فخری بھی خاموش ہو گئے اور بھگدڑ مچ گئی۔ چند سیکنڈ میں ہال خالی ہو گیا۔ سینئر شعراء کو مایوسی ہوئی کہ ان کی باری پر سامعین غائب ہوں گے، میں نے سب کو یقین دہانی کرائی کہ آپ اسی "موڈ" کو قائم رکھیں سکرین پر یہی ماحول دکھائی دے گا تاہم "انرجی لیول" قائم نہیں رہ سکا" موشن، ٹوٹنے والی بات تھی، ریحانہ جاتے جاتے اشارہ کر گئیں کہ فکر نہ کریں لیکن ہم بھی مایوسی سے نہ بچ سکے پھر بھی دس سے پندرہ منٹ بعد مہمانوں کی ٹولیاں واپس آنا شروع ہو گئیں بلکہ وہ دوسرے لوگوں کی بھی بڑی تعداد ساتھ لے آئے۔ شعراء اکرام نئے جذبے اور ولولے سے مشاعرے کو ایک بار پھر بلندی پر لے گئے اور ہم اپنی قسمت پر رشک کرتے ہوئے "ریحانہ" کو قدرت کا انعام سمجھ کر دعا دیتے رہے۔ بہت یادگار مشاعرہ تھا یہ، برسوں پہلے کی بات ہے اس لیے حافظہ ساتھ نہیں دے رہا کہ شعراء کا یادگار کلام بھی شامل کر سکتا، تاہم اس یادگار اور منفرد محفل مشاعرہ کا اختتام اچھا نہیں ہو سکا، ریکارڈنگ کے بعد شرکاء محفل نے جناب انور مسعود سے "بنیان" اور "بھنڈیوں" کی فرمائش کے علاوہ بابا نجمی ابوذری سے "رہتی ہے میرے شہر میں شب رات مسلسل" سننے کی فرمائش کر دی، میں نے رضامندی کا اظہار کر دیا لیکن اس کے ردعمل میں قتیل شفائی نے سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے فرمایا "مشاعرہ ختم ہو گیا جس نے کسی شاعر کو سننا ہے تو وہ اسے اپنے گھر بلا کر فرمائشیں پوری کرے" اور ان کے اس اعلان کے بعد تمام شعراء قتیل شفائی صاحب کے احترام میں سٹیج سے اتر کر پیچھے چلے گئے لیکن بابا ابوذری اور انور مسعود صاحبان نے میری درخواست قبول کرتے ہوئے ادھار مانگے سامعین کی فرمائش نقد میں پوری کر دی، تاہم ہال کے پچھلے حصے میں موجود قتیل شفائی سمیت تمام شعراء اکرام نے "ہائی ٹی" کے ساتھ مجبوراً ان دونوں کو سنا، اس لیے کہ میری جانب سے "اعزازیہ" بعد میں ادا کیا گیا، پھر بھی یہ مشاعرہ شعراء اور مانگے تانگے کے سامعین کے ساتھ یادگار رہا اور وقتِ رخصت ضمیر جعفری اپنے دونوں ساتھیوں سمیت ہوٹل نہیں گئے بلکہ "کریلے گوشت" سے لطف اندوز ہونے کے لیے بشریٰ رحمٰن صاحبہ کے ساتھ چلے گئے۔

آج یہ دونوں شخصیات دنیا میں نہیں لیکن اپنے فن اور خدمات کے حوالے سے انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، دونوں "گوہر نایاب" تھے۔ اللہ اُن کے درجات بلند کرے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

اختر حسین جعفری ایک عہد ساز شاعر

جب سے قدرت نے یہ دنیا تخلیق کی ہے اور اس پر حضرتِ انسان نے قدم رنجہ فرمایا اور آباد ہو کر مختلف گروہوں میں بٹ کر رہنا شروع کیا۔ اس نے اپنی میلانِ طبع اور فطرت کے مطابق اظہارِ خیال کا طریقہ اختیار کیا۔ وہ رقص کی صورت میں، وہ قہقہے کی صورت میں، وہ رونے پیٹنے کی شکل میں، پینٹنگز کر کے موسیقی کی صورت میں کوئی تحریر لکھ کر بھی ہو سکتا ہے لیکن اظہار کا سب سے مؤثر ذریعہ شاعری کی صورت میں سامنے آیا ہے یہ ایسا طریقہ تھا جو سب سے زیادہ مؤثر تھا کیونکہ شاعری کے استعمال میں زبان بھی نظر آتی ہے اور ردھم بھی ہوتا ہے۔ زبان اور ردھم مل کر شاعری کو تخلیق

فیصل زمان چشتی

کرتے ہیں۔ اسی لیے انسانی تاریخ میں شاعروں کو عظیم اور بلند مرتبہ مانا گیا اور شعر کا اثر ہزاروں سال بعد بھی رہتا ہے۔ کیونکہ شاعری کسی بھی دور کی تاریخ، تہذیب وتمدن اور ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے اور شاعر کے مشاہدات اور تجربات اس کا جزو لاینفک ہوتے ہیں۔ شاعری صرف داخلی صورت حال کو بتانے کا عمل ہی نہیں بلکہ اس میں خارجی حالات وعوامل جیسا کہ معاشرت، سماج عام لوگوں کے رویے اس عہد کے جھوٹ اور سچ بھی پوری طاقت کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔

اردو شاعری کی تاریخ بھی بڑے بڑے شاعروں کے نام سے بھری پڑی ہے پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا مگر چند نام ایسے ہیں جن سے رُوگردانی یا منہ نہیں پھیرا جا سکتا ان میں نظم کے بے مثال اور باکمال شاعر جناب اختر حسین جعفری کا نام سرفہرست ہے۔ وہ ایسا کام کر گئے جو ہماری نسلوں کا اثاثہ ہے۔ ان کی شاعری کی اتنی پرتیں، تہیں اور جہات ہیں جن کو کھولنے اور بیان کرنے کو ایک عمر درکار ہے اُن کی تراکیب، مفاہیم، مقصدیت، معنویت، تکنیک، مضامین اور شاعرانہ عظمت کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے نقاد بجہ چند شاعروں سے آگے بڑھنے میں تامل سے کام لیتے ہیں یہی وجہ ہے جو ہمارا ادب زوال پزیر نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں زوال پذیر نہیں ہے۔ اختر حسین جعفری کی شاعری میں تفکر کا خم، تمثال نگاری کے شہکار، فکری تلازمے، مضامین کی نازک خیالی، شعور وفکر کی قوس قزح اور قابل رشک زورِ بیاں اپنے پورے جمالیاتی ولفریبی اور تدبرانہ آہنگ کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ اختر حسین جعفری ہماری نظریاتی اساس اور فکر وآگہی کے وارث نظر آتے ہیں اُن کی تشبیہات واستعارات اور علامتی نظام اتنی مضبوط بنیادوں پر استوار ہے جو ہمیں کسی اور شاعر کے ہاں نظر نہیں آتا۔ اُن کا یہ نظام سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ان کے کلام پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اُن کے کلام پر کام کیا جائے اس کو کھولا جائے اس کا ابلاغ کیا جائے کیونکہ ایسی نابغۂ روزگار ہستی کو نظر انداز کرنا اور پہلو تہی کرنا ہمارے ادب عالیہ کے لیے زہرِ قاتل ہے۔ جب غالب کو سمجھنے کے لیے اُس کی شرح کی جا سکتی ہے تو اختر حسین جعفری کی کیوں نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نظام چلانا ہے اب بھی ہمارے پاس عالی دماغ شخصیات موجود

ہیں لیکن بات صرف اپنے دائرے سے نکل کر صحیح سمت سوچنے کی ہے۔ اُن کی نظم دیکھیے:

عجیب وہ سیل تھا کہ جس نے ___ کنارِ دریا
کی سرحدوں میں نئے اضافے کیے ہیں
تازہ زمین آباد کر گیا ہے ___ عجیب وہ
دھوپ تھی جو پیشِ ازسحر کی ___ ساعت کے
گھر میں اُتری تو جیسے سوئے ہوئے لبوں پر
___ نشانِ الفت لگا گئی ہے ___ عجیب لمحہ تھا
جس نے سر پر چمکتے سورج کے گرم رستے
پہ پا برہنہ سفر کیا ہے ___ وہ دھوپ تیرے
جمال کی تھی ___ وہ سیل میرے خیال کا تھا
___ وہ لمحہ تیرے وصال کا تھا

اختر حسین جعفری کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن کا کینوس خوبصورت خیالات کے رنگوں کی قوسِ قزح سے بھرپور جذبات و احساسات، پورے شعری اور فکری رچاؤ کے ساتھ اپنے احساسِ حسن کی دلپذیری اور جادوگری دکھاتا نظر آتا ہے۔ اُن کی شاعری خاص طور پر نظم میں کرافٹ، جمالیات، خیالات کا بانکپن اور مصرعوں کی بُنت اپنے پورے جمالیاتی رنگ و آہنگ اور اوجِ کمال پر قاری کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے اس کے دلوں کی تاروں کو چھیڑنے میں مصروفِ عمل نظر آتے ہیں۔ اختر حسین جعفری شاعری کا وہ حوالہ ہے جس نے جدید اردو نظم میں وہ کمالات و معجزات کیے اور ایسے معیارات مقرر کر دیئے جن میں لفظوں کی سحرانگیزی، فکر و نظر کی پختگی، لہجے کی جدت طرازی، تازگی و شگفتگی، ندرتِ خیال موسیقیت اور نغمگی اپنی ملائمت اور شعری جمال کے ساتھ ضوفشاں نظر آتی ہے۔ اختر حسین جعفری کا بنیادی حوالہ نظم ہے مگر ان کی غزل بھی اپنا منفرد حسن و جمال اور کیفیات کا جہان لیے ہوئے ہے۔ غزل میں بھی ان کا منفرد لہجہ اور اسلوب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اُن کی غزل کے چند اشعار آپ کی باذوق سماعتوں کے لیے حاضر ہیں۔ دیکھیے گا کہ ان کی غزل بھی کیا منفرد ہے اور جذبات و کیفیات کا حسین مرقع ہے:

ہجر اک حسن ہے اس حسن میں رہنا اچھا
چشمِ بے خواب کو خونناب کا گہنا اچھا
کوئی تشبیہ کا خورشید نہ تلمیح کا چاند
سرِ قرطاس لگا حرف برہنہ اچھا
دھوپ اُس حسن کی یک لحظہ میسر تو ہوئی
پھر نہ تا عمر لگا سائے میں رہنا اچھا

وہ جدید اردو نظم کے باکمال اور ممتاز شاعر تھے۔

انھیں بیسویں صدی کا غالب بھی کہا جاتا ہے اور بعض نقادوں کے مطابق اختر حسین جعفری بیدل کے بعد سب سے اہم شاعر ہیں۔ انھوں نے آزاد شاعری کو نئی جہات سے روشناس کرایا ہے۔ اُن کو جس قدر عزت شہرت اور وقار ملا وہ بجا طور پر اس کے حقدار بھی نظر آتے ہیں۔ تمام عظیم شعرا، کی طرح اُن کی شاعری کے پرت اور معانی ابھی تک لوگوں پر نئے مفاہیم کے ساتھ کھل رہے ہیں کیونکہ بڑا شاعر وژنری ہوتا ہے اور وہ آئندگان کے لیے بھی لکھتا ہے حال کے ساتھ ساتھ مستقبل پر بھی اس کی گہری نظر ہوتی ہے۔

اُن کا شہرۂ آفاق شعری مجموعہ آئنہ خانہ شعرو فن کا ایک ایسا شہکار ہے جس میں ان کی شاعری اوج کمال پر نظر آتی ہے اور ان کا ادبی قد رفعتوں کی بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ اُن کی شاعری نے اردو ادب کے وقار میں بے پناہ اضافہ کیا ہے اور وہ دنیائے شعر و ادب کے ماتھے کا جھومر قرار پائے اور سرمایۂ افتخار ٹھہرے۔

انھوں نے اپنے جاندار اسلوب طاقتور شعری اظہار اور فنی و فکری گہرائی سے ثابت کیا ہے کہ وہ جدید اردو نظم کے امام ہیں۔

اختر حسین جعفری اپنی اوائل عمری سے ہی انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہو گئے تھے اور انھوں نے اپنی نظریاتی وابستگی اور پختہ کاری کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے ثابت کیا ہے کہ وہ آفاقی اور کائناتی شعور کے شاعر ہیں۔ انھوں نے نظریہ قلبی واردات اور شعری بصیرت کو یکجا کر کے ایسا شعری اسلوب تخلیق کیا جو صرف اور صرف انھی کا ہی خاصا ہے۔ اور آئندگان کے لیے نشانِ منزل بھی ہے۔ وہ اپنے قاری پر اپنی شعری آگہی کے ذریعے گہری معنویت کے اسرار کھولتے نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں دو تین اشعار:

تپش گلزار تک پہنچی لہو دیوار تک آیا
چراغ خود کلامی کا دھواں بازار تک آیا
محبت کا بھنور اپنا شکایت کی جہت اپنی
وہ محور دوسرا تھا جو مرے پندار تک آیا
عجب چہرہ سفر کا تھا ہوس کے زرد پانی میں
قدم دلدل سے نکلا تو خطِ رفتار تک آیا

دورِ آمریت میں ان پر کڑا وقت بھی آیا لیکن وہ مردِ آہن کی طرح اپنے نظریے اور مؤقف پر ڈٹ کر کھڑے رہے انھوں نے ریاستی ظلم و جبر کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ دھمکیوں اور خطرات کے باوجود ان کے پائے استقلال میں ذرہ برابر لغزش نہ آئی یہ ان کی اپنے نظریے اور ادب سے وفاداری اور استقامت کی انتہا تھی۔

یہ اُن کی شخصیت میں چھپے جواہر تھے جن کا عکس اُن کی شاعری میں در آیا کیونکہ اُن کی شاعری ان کی شخصیت کی طرح شفاف اور اُجلی ہے۔ ان کی شاعری اس آئینہ کی طرح ہے جس میں قاری کو زمانے کے رنگ صاف نظر آتے ہیں اور ابہام کی بھول بھلیوں میں بھٹکے بغیر صراطِ مستقیم کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ اُن کی شاعری ایک ایسی تسبیح ہے جس کا ہر دانہ اپنے اندر شعور و ادراک کے جہان اور افلاک کی وسعتیں لیے ہوئے ہے۔ شعری منظر نامہ ان کی شاعری کے بغیر نامکمل ہے اور اُن کی ادبی خدمات کو کسی بھی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا:

چپک گیا ہے جلی انگلیوں کی پوروں سے
بجھے چراغ میں جیسے شرر تھا خوابیدہ
دن سے اترے شمکن در شمکن لباس ہوا
لہو کی لہر کسی ساحل یقیں پہ رُکے
ہٹے نگاہ کے شیشے سے عکس کا پردہ
تو وہ سپیدۂ خواب ازل نظر آئے
اٹھائے پھرتا ہے جس کی شبیہہ ناخنِ درد
فلک کی شاخ سے اُتریں وہ طائرانِ ابد
پروں سے جن کے اُفق تا اُفق دمِ پرواز
زمینِ منتظر ، وہ کوہِ بے ارادہ پر
دھنک کے رنگ میں گرد مسات کرتی ہے

.....

اختر حسین جعفری نے اپنی شاعری میں کربلا کا استعارہ بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی صاحبِ دل اور صاحبِ درد اس واقعہ سے پہلو بچا کر نہیں گزر سکتا۔ مذہب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اگر ہم صرف ظالم اور مظلوم کی بات کریں حق اور باطل کی بات کریں سچ اور جھوٹ کی بات کریں تو ہر جگہ ہر کربلا ایک زندۂ جاوید حقیقت بن کر ہمارے سامنے آموجود ہوتا ہے۔ تمام مذاہب کے ماننے والے واقعۂ کربلا سے روشنی اور راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ مسلکی بنیادوں سے ہٹ کر اختر حسین جعفری چونکہ مظلوم طبقے کے ساتھ کھڑے ہیں۔ مظلوم اور بے کس طبقے کے لیے اُن کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں اور ان کی پوری زندگی سچائی اور حق گوئی سے عبارت ہے۔ اس لیے ان کو کربلا والوں کو یاد رکھنا اُن سے ہدایت کی کی روشنی و رہنمائی لینا اُن کی مظلومیت اور دکھ درد کو اپنی شاعری میں ایک طاقت کے طور پر استعمال کرنا بنتا ہے اُن کی شاعری ظالم حکمران اور ظلم و جبر کے خلاف ایک توانا اور بھرپور آواز بن کر سامنے آئی۔ وہ ظلم کے خلاف کھڑے ہیں چاہے وہ دنیا کے کسی خطے میں بھی ہو اسی لیے ایک کربلا کا نہیں انھیں کربلاؤں کا شاعر کہا جاتا ہے۔ ان کا نام اور آوازِ حق کا استعارہ بن کر ظلم کے ایوانوں میں گونج رہا ہے۔ اسی لیے ان کو آفاقی اور

کائناتی شعور کا شاعر قرار دیا گیا ہے۔ محرم کے حوالے سے اُن کی ایک نظم ''امتناع کا مہینہ'' ملاحظہ کیجیے۔

اس مہینے میں غارت گری منع تھی، پیڑ کٹتے
نہ تھے، تیر بکتے نہ تھے
بہر پرواز محفوظ تھے آسماں
بے خطر تھی زمیں مستقر کے لیے ___ اس
مہینے میں غارت گری منع تھی یہ پرانے
صحیفوں میں مذکور ہے
قاتلوں، زہرنوں میں یہ دستور تھا، اس مہینے کی
حرمت کے اعزاز میں ___ دوش پر گردنِ خم
سلامت رہے کربلاؤں میں اترے ہوئے
کاروانوں کی مشکوں کا پانی امانت رہے ___
میری تقویم میں بھی مہینہ ہے یہ ___ اس مہینے
میں کئی تشنہ لب ساعتیں، بے گناہی کے کتبے
اُٹھائے ہوئے ___ روز و شب بین کرتی ہیں
دہلیز پر اور زنجیرِ در مجھ سے کھلتی نہیں ___ فرشِ
ہموار پر پاؤں چلتا نہیں ___ دل دھڑکتا
نہیں ___ اس مہینے میں گھر سے نکلتا نہیں

اختر حسین جعفری شریف النفس، حلیم الطبع اور وضع دار شخصیت کے مالک تھے۔ ایک اعلیٰ سرکاری افسر ہونے کے باوجود عاجزی، انکساری اور ملنساری کا منبع تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے ''آئینہ خانہ'' اور ''جہاں دریا اترتا ہے'' کلیات ''آخری اُجالا'' کے نام سے منصۂ شہود پر آ چکی ہے۔ 2002 میں حکومتِ پاکستان نے اُن کی گرانقدر ادبی خدمات کے عوض بعد از وفات ''صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی'' سے نوازا۔ آئینہ خانہ کو آدم جی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

ان کو اپنی زندگی میں ہی جدید اُردو نظم نگاری کے حوالے سے مستند اور معتبر مقام مل چکا تھا۔ بہت سے نقاد جدید نظم کے حوالے سے کسی بھی شاعر کو اختر حسین جعفری سے بڑا شاعر تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

آخر میں مَیں ان کی شہرۂ آفاق نظم جو انھوں نے امریکی شاعر ایذرا پاؤنڈ کی وفات پر لکھی:

تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں
تو جدا ایسے موسموں میں ہوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں
انتظارِ بہار بھی کرتے
دامنِ چاک سے اگر اپنے
کوئی پیمان پھول کا ہوتا
آ تجھے تیرے سبز لفظوں میں
دفن کر دیں کہ تیرے فن جیسی
دہر میں کوئی نو بہار نہیں

☆☆☆☆☆

سید افسر ساجد کی مرتب کردہ نئی کتاب ''کچھ خطوط میرے نام'' چند اہم پہلو

سید افسر ساجد اردو اور انگریزی کے معروف ادیب ہیں - ملک اور بیرونِ ملک ادبی حلقوں میں شناخت رکھتے ہیں اور ادبی تقاریب اور مشاعرے برپا کرنے میں بھی یدِ طولی رکھتے ہیں- ان کا کیریئر شعبہ تعلیم و تدریس اور سول سروس پر محیط ہے- آپ نے پنجاب کی صوبائی سول سروس میں 26 سال کامیابی سے گزارے اور بطور ڈپٹی کمشنر ریٹائر ہوئے- شعبہ تعلیم میں ان کا کیریئر 28 سال پر محیط ہے- انھوں نے فیصل آباد اور نوشہرہ (کے پی کے) کے گورنمنٹ کالجوں میں انگریزی زبان و ادب کی تدریس کی- گزشتہ 19 سالوں سے وہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد میں بطور وزیٹنگ فیکلٹی انگریزی ادب اور قانون کے شعبوں میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں-

آپ کی تصانیف میں اردو کے دو شعری مجموعے ''وجود ایک واہمہ ہے، اور حیرت شامل ہیں - اردو میں تنقیدی مضامین، تبصروں اور تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب 'ترسیل' اور ان کی انگریزی میں تنقیدی مضامین، تبصروں اور خاکوں پر مشتمل کتابوں میں Perceptions, Appraisals, Profiles and Dialogues اور Evaluations شامل ہیں-

زیرِ تبصرہ کتاب ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مشاہیرِ ادب نے ان کے نام تحریر کی، کچھ خطوط مختصر ہیں اور کچھ طویل- ان خطوط کی تحریر کا دورانیہ 1988 سے 2014 ہے- عام طور پر معروف شعرا کے خطوط، تحقیق حوالے سے مرتب کیے جاتے ہیں تا کہ تخلیق کار کے کچھ تشنہ پہلو سامنے آسکیں- تاہم یہ

خرم خرام صدیقی

خطوط وہ ہیں جو سید افسر ساجد کے نام تحریر کیے گئے۔ مختصر خطوط میں کتابوں کی وصولی کی رسید اور تبصرہ نگاری کے لیے شکریہ ادا کیا گیا ہے جبکہ نسبتاً طویل خطوط میں چند اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔

سب سے اہم پہلو تو ان عظیم مشاہیرِ ادب کے ادب اور شاعری کے حوالے سے نظریات کے طور پر سامنے آتا ہے یعنی مصنف کی کتاب کی وصولی کے بعد کسی معروف ادیب نے ادب کے حوالے سے اپنے اہم نظریات بھی پیش کیے ہیں۔

محمد سلیم الرحمٰن صاحب کتابوں پر فلیپ لکھنے کی روایت کے ختم ہونے کی بات کرتے ہیں اور راجا عبدالقادر کے لکھے گئے فلیپ کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ عبدالحمید نصر اس بات پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ افسر ساجد نے پڑھنے لکھنے کا کام جاری رکھا ہے، یعنی ان کے خیال میں پڑھنے لکھنے کا عمل انسان کو تادم آخر جاری رکھنا چاہیے۔ وہ تخلیقی کام کی حوصلہ افزائی کے قائل بھی ہیں۔

قیصر رضوی صاحب کے نزدیک اچھی کتابوں کا مطالعہ ذہنی آسودگی کا باعث ہوتا ہے۔ ادب یا اس سے متعلقہ اصناف انسان کے علم میں اضافے کے ساتھ ساتھ ذہنی سکون کا باعث بھی بنتی ہیں۔

احمد رضا صاحب انگریزی میں لکھنے والے پاکستانی ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے قائل ہیں کیونکہ ان کے نزدیک پاکستان میں درجن بھر لوگ بھی ایسے نہیں جنھیں انگریزی تحریر میں مہارت ہو لہٰذا اس حوالے سے حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔

جناب تمر رضا شہزاد خاکہ نگاری کی صنف کے حوالے سے بات کرتے ہیں اور اس کو ایک مشکل صنفِ ادب گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس صنف میں مہارت کے لیے ضروری ہے کہ مصنف کے پاس قوتِ مشاہدہ ہو اور وہ دیوار کے پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ کیونکہ اس صنف میں کسی شخصیت کے خفیہ گوشوں کا تخلیقی سطح پر اظہار کیا جاتا ہے۔

ادبی نظریات کے حوالے سے شاہین مفتی صاحبہ کا طویل خط اہم ہے جس میں انھوں نے ادب کے بارے میں اپنے عمومی نظریات اور ادب اور قاری کے رشتے کے حوالے سے بہت اہم باتیں کی ہیں۔ ان کے خیال میں ہمارے ادب کے قاری کے پاس فارمولا قسم کے جذبات ہوتے ہیں اور وہ فکر انگیز تحریروں کے بجائے اپنے فارمولے کے مطابق ادب کو لیتا ہے اور فکر انگیز ادب بہت تاخیر سے توجہ حاصل کرتا ہے۔ یہاں بحث ادب برائے ادب یا ادب برائے معاشرہ کی طرف جاتی ہے۔ وہ صرف اپنے جیسے خوش فکر لوگوں اور اپنے لیے ادب تخلیق کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک تخلیق کار کی اپنی تربیت بھی ضروری ہے کہ وہ کن رویوں کو پروان چڑھاتا ہے اور کتنی

ریاضت کرتا ہے۔ وہ شاعری میں صنفی امتیاز یعنی مرد اور عورت کے علیحدہ علیحدہ خانوں کے رجحان کو ناپسند کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک خواتین شعرا میں نسوانیت کے باوصف گہرا انسانی شعور ہوتا ہے جسے عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ قاری کو ایسی شاعری کی ضرورت ہے جو فاسٹ فوڈ کی طرح ہو۔ وہ آمد اور آورد کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے غالب کے مصرعے کی قائل ہیں:

'آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں'

شاہین صاحبہ کے خیال میں وہ شاعر جو افسران بھی ہیں انھیں مشاعرے میں شرکت کرتے رہنا چاہیے۔ اس سے ان کا فشارِ خون بھی معمول پر رہتا ہے اور وہ کچھ وقت کے لیے خود کو عام انسان بھی سمجھتے ہیں جو عام لوگوں کے درمیان شعری خیالات کا اظہار کر سکے۔

ڈاکٹر عرش صدیقی ادب میں اور خاص طور پر شاعری اور تبصرہ نگاری میں اختصار کی اہمیت پر زور دیتے ہیں اور فرماتے ہیں، "آپ لفظ ضائع نہیں کرتے"، ولیم شکسپیر کے نزدیک بھی "Brevity is the Soul of Wit" ہے۔ وہ شاعر کی اس بے بسی کا تذکرہ بھی کرتے ہیں، جس کی وجہ سے شاعروں اور ادیبوں کو خود پیسے خرچ کر کے کتاب شائع کرنی پڑتی ہے۔

شہزاد احمد بھی ادب میں اختصار کی اہمیت کو مقدم جانتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ نے چند الفاظ میں بڑے مفاہیم کو قید کرنے کی کوشش کی ہے، یہ الفاظِ دیگر 'دریا کو کوزے میں بند کرنا'، ادب اور شاعری کی نمایاں خوبی ہے جبکہ عام طور پر لوگ بات کو پھیلاتے جاتے ہیں اور تکرار کرتے ہیں۔

شوکت واسطی تبصرہ نگاری کے لیے مکمل سیاق و سباق سے واقفیت اور مطالعے کے بعد رائے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں اور زبان کی شگفتگی اور جامعیت کی خوبیوں کو اہم سمجھتے ہیں۔

افتخار عارف صاحب کے نزدیک کسی کی تحریر یا شخصیت کے بارے میں لکھنا ایک مستحسن قدم ہے اور اس کی تعریف نہ کرنا، "بہت بری بات ہے۔"

ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ زندگی کے بے بضاعتی اور ادیب اور شاعر کی بے وقعتی کے ساتھ اردو اور پنجابی شاعروں کو انگریزی میں متعارف کروانے کے رجحان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا اردو زبان کے اہم نقادوں اور نظم نگاروں میں شمار ہوتے ہیں اور وہ اپنے خط میں مشرق و مغرب کے ادبی روابط کے حوالے سے بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انھوں نے سانڈرا فاؤلر کی نظموں کے مجموعے EVE-SUNSET کا پیش لفظ تحریر کیا ہے اور غالباً یہ پہلی مرتبہ ہے کہ کسی اردو ادیب نے انگریزی کے مجموعے

کا پیش لفظ تحریر کیا۔ ایک دوسرے خط میں وہ اپنی ادبی عظمت کا ثبوت دیتے ہوئے افسر ساجد صاحب کے متوازن تبصرے کی تعریف کرتے ہیں جو انھوں نے ان کی ایک نظم پر تحریر کیا۔ اس خط سے تنقید میں خلوص، توازن اور غیر متعصبانہ انداز کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، جو فی زمانہ گروپنگ کے دور میں مفقود نظر آتا ہے۔ ایک اور خط میں ڈاکٹر وزیر آغا نے افسانہ نگاری کے فن پر بیش قیمت تبصرہ کیا ہے اور افسانے میں بیانیہ انداز سے زیادہ واقعات نگاری کی اہمیت پر زور دیا ہے یعنی افسانہ نگار انجام کو خود بیان کرنے کے بجائے واقعات کو ایسا کرنے کی اجازت دے تو افسانہ ایک فن پارہ بن جاتا ہے۔ ایک کہانی کا حوالہ دیتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ کہانی کے مرکزی کردار کو والدین کی اہمیت کا احساس واقعات کے ذریعے ہونا چاہیے تھا۔ انور مسعود اپنے خط میں نعت کی صنف کے حوالے سے بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے نعت کے درود کے ذیل میں شمار کیا ہے۔

کچھ خطوط میں ادب اور معاشرے کے باہم تعلق پر بھی قیمتی آرا موجود ہیں۔ ادیب اور بالخصوص شاعر اور معاشرے کے باہمی تعلق اور تامل کو ہمارے روایتی مشاعرے نے بہت مضبوط کیا کیونکہ شعرا کرام مشاعرے کے دوران معاشرے سے براہِ راست مکالمے کی شکل میں مخاطب ہوتے ہیں اور لطف و انبساط کے ساتھ دانشمندی اور سمجھ بوجھ سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ یہ روایت اب کم ہوتی جا رہی ہے، بہت سے خطوط نگاروں نے سید افسر ساجد کے منتظم کردہ کُل پاکستان مشاعرے کی تعریف کی ہے جو بہت کامیابی سے گوجرہ میں منعقد کیا گیا تھا۔ شبیر قادری نے اہلِ قلم ڈائریکٹری کے حوالے سے ان کے کردار کو سراہا ہے۔ درانجم عارف نے بھی فیصل آباد اور گوجرہ میں منعقدہ مشاعروں کی تعریف کرتے ہوئے اسے ادب اور معاشرے کے مابین ایک اہم ربط قرار دیا ہے۔

محترم جناب حکیم محمد سعید (مرحوم و مغفور) جو پاکستان کی نابغہ روزگار ہستیوں میں شامل تھے انھوں نے سید افسر ساجد کے پہلے مجموعہء کلام ''وجود اک واہمہ ہے'' پر رائے دیتے ہوئے شاعری کے حوالے سے بہت اہم باتیں کی ہیں۔ وہ ٹی ایس ایلیٹ کا حوالہ دیتے ہوئے شاعری کو جذبات و احساسات کا اظہار قرار دیتے ہیں، اگرچہ شاعری میں خیال بھی اہم ہوتا ہے مگر وہ احساس کے عمل میں ڈھلنے کے بعد سامنے آتا ہے ورنہ شاعری محض وعظ و تبلیغ بن جاتی ہے۔ زاہد حسن اپنے خط میں شاعری میں تخلیقی حیرت اور پراسراریت کے عناصر کو اہم خوبی قرار دیتے ہیں۔ نصیر احمد ناصر شاعری میں داستانی فاصلوں کے سفر،

اجنبیت کے خالی پن، ان کہی آشنائیوں کے کرب اور خلا سے بھی زیادہ بے وجودیت کو متوجہ کرنے والی خوبیاں قرار دیتے ہیں۔

عبداللہ حسین شاعری میں اختصار کی اہمیت پر زور دیتے ہیں یعنی شاعری میں رمز و کنایہ اہم عناصر ہیں۔

افتخار عارف جو اردو کے صفِ اول کے شعرا میں شمار ہوتے ہیں، شاعری میں فکر کی گہرائی کو اہم سمجھتے ہیں جو آج کی شاعری میں کم کم نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر بھی شاعری میں اختصار کی اہمیت پر زور دیتے ہیں اور اردو کتابوں پر انگریزی تبصروں کو پاکستانی اہلِ قلم کو انگریزی خواں افراد سے متعارف کروانے کا اہم ذریعہ سمجھتے ہیں۔

پروفیسر غلام جیلانی اصغر اچھی شاعری کی داد نہ دینے کو ناانصافی پر محمول کرتے ہیں اور اسے ناقابلِ برداشت رویہ قرار دیتے ہیں۔ شگفتہ الطاف صاحبہ مشاعرے اور ادبی محافل کو ادب پروری اور ادب اور معاشرے کے درمیان رابطے کا اہم ذریعہ گردانتی ہیں۔

محمد علی صدیقی اپنے خط میں تبصرہ نگاری کے فن میں گہری اور عمیق مطالعے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں کیونکہ اکثر لوگ محض سرسری مطالعے کے بعد تبصرہ تحریر کرتے ہیں اور بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی کاوشوں پر جلد بازی میں دو یا تین صفحے لکھ کر معاملہ نپٹا دیتے ہیں جو ایک اچھی روش نہیں۔ ان کے نزدیک تبصروں کو کتابی شکل میں یکجا کر کے چھاپنا بھی ادب کی خدمت ہے اور بلند و بانگ دعووں کے بجائے خاموشی سے یہ خدمت انجام دینا زیادہ مناسب ہے۔

کتاب میں شامل دو خطوط بطورِ خاص اہم ہیں کیونکہ ان خطوط میں ادبی رائے کے علاوہ ملکی حالات اور خاص طور پر ملکی اداروں کو بدعنوانی کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ سید سرفراز حسین صاحب جو ملتان ڈویژن کے سابق کمشنر رہ چکے ہیں، شاہ جہاں ہاؤس لاہور سے رقمطراز ہیں کہ شاعری کی خوبی نازک خیالات اور احساسات کو خوبصورت لبادہ دینا ہے۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ انٹی کرپشن کا ادارہ جو انھوں نے 1985 میں re-organize کیا تھا وہ اپنی اصل روح کھو بیٹھا اور محض پولیس کا ایک ذیلی ادارہ بن کر رہ گیا اور چھوٹے چھوٹے مقدموں اور ریڈروں کی نذر ہو گیا۔ وہ بڑے دردمندانہ انداز میں فرماتے ہیں کہ ملک میں ایک چھوٹا سا ادارہ ایسا قائم ہونا چاہیے جس میں تمام کام دیانتداری اور فرض شناسی سے انجام دیے جائیں۔

دوسرا سب سے انتہائی اہم خط سب سے آخر میں ہے جو غلام رسول تنویر نے تحریر کیا ہے۔ وہ لکھاری کے لیے حوصلہ افزائی اور وقت کی اہمیت پر زور دیتے ہیں کیونکہ تخلیق کار وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تخلیق

یورش، سہولتوں اور مطلوبہ ماحول سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے اسے چاہیے کہ وہ اپنی تخلیقی کاوشوں کو جلد از جلد کتابی شکل میں منظرِ عام پر لے آئے۔ کتابوں پر دیے جانے والے ایوارڈز کے حوالے سے اظہارِ رائے کرتے ہوئے موصوف فرماتے ہیں کہ یہ انسان کو ایسی پٹڑی پر چڑھا دیتے ہیں جس سے وہ کئی کتابوں کا مصنف بن جاتا ہے۔ وہ کسی خاص علاقے یا شہر میں موجود مختلف تخلیق کاروں کی تحریروں کو یکجا کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیتے ہیں اور سوانح عمری جیسی صنف پر بھی آہستہ آہستہ کام آغاز کرنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ اور اس سوانح عمری میں وہ سید افسر ساجد سے پاکستان کی بیوروکریسی پر ایک مفصل باب لکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ ایک سی ایس پی خاتون کی تحریر کردہ اعلیٰ سروسز کی تاریخ کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ یہ تاریخ اگرچہ انٹرنیٹ سے لیے گئے مواد پر مشتمل ہے اور کئی حوالوں سے نامکمل ہے مگر پھر بھی قابلِ ستائش ہے۔

وہ پاکستان کے ان دیانتدار سول افسران کا تذکرہ کرنے کا مشورہ بھی دیتے ہیں جنھوں نے نہرو کی اس پیشین گوئی کو باطل ثابت کر دیا کہ پاکستان 6 ماہ سے زیادہ نہیں چلے گا۔ وہ نہرو کے منفی کردار کا حوالہ بھی دیتے ہیں جو اس نے پاکستان اور بھارت کے مابین نفرت کے بیج بو کر ادا کیا۔ وہ چند قابلِ فخر I.C.S کا تذکرہ کرنے کا کہتے ہیں جنھوں نے مختلف شعبوں میں پاکستان کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا اور ان کے اس کردار کے بغیر پاکستان کا استحکام ناممکن تھا۔ وہ غیر جانبداری سے بیوروکریسی کے منفی کرداروں کو بے نقاب کرنے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔ یہ خط اپنی نوعیت کے اعتبار سے چند صفحوں میں نہایت اہم باتیں سموئے ہوئے ہے جس میں چشم کشا انکشافات اور دانش کے موتی بکھرے ہیں۔

الغرض یہ کتاب اگرچہ مختلف ادیبوں کے دوستانہ اور بے تکلفانہ انداز میں تحریر کیے گئے خطوط پر مشتمل ہے مگر اس کتاب کو پڑھ کر قاری کو پاکستان کی ادبی تاریخ، مختلف اصنافِ سخن کے حوالے بیش قیمت آرا، ادب اور معاشرے کے باہمی تعلق، مختلف اصنافِ سخن کے حوالے سے بیش قیمت آرا، اور تاریخ کے اہم سنگِ میل کا ادراک ملتا ہے۔ خطوط لکھنے والوں کی ملک سے وابستگی، اقدار اور بدلتے حالات پر رائے بھی معلومات کے بہت سے در وا کرتی ہے۔ ادب اور شاعری کے سنجیدہ قاری کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ سید افسر ساجد نے یہ کتاب تحریر کر کے اچھی روایت قائم کی ہے جس سے طلبہ، معاشرے اور اہلِ علم کو فائدہ پہنچے گا۔

☆☆☆☆☆

پیارے بچوں کے لیے علمی وادبی کہانیاں ___ رخشندہ نوید

اس حقیقت کو رد کرنے کے لیے ہمارے ہاں کوئی جواز باقی نہیں رہا کہ ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے بچوں کے ادب کی جانب دھیان کرنے میں مجرمانہ غفلت کا رویہ اپنایا ہوا ہے۔ وہ زمانہ ماضی ہوا کہ جب حکیم محمد سعید، صوفی تبسم اور قیوم نظر جیسے دانشور بھی بچوں کے لیے لکھا کرتے تھے۔ ان کے بعد کے خلا کو پر کرنے کے لیے جب ہمارے ہاں اس معیار کا ادب تخلیق نہ ہوا تو ہیری پوٹر اور ڈورے مون جیسے بدیسی کرداروں نے ٹوٹ بٹوٹ کی جگہ لے لی اور ماضی قریب کی ہماری کئی نسلوں کو اپنی تہذیب سے بیگانہ کیے رکھا۔ غیر ملکی ثقافتی یلغار کا سامنا کرنا تو ایک طرف رہا ہم نے تو اتنا بھی نہ کیا کہ مغربی کارٹون فلموں کو اردو ہی میں ڈب کر لیں بلکہ اس کہ واسطے بھی ہندی میں ڈب شدہ فلموں کو اپنے میڈیا کی زینت بنا دیا گیا۔ مایوسی کے اس اندھیرے میں رخشندہ نوید جیسی شاعرہ کا بچوں کی کہانیوں کی طرف آنا میرے لیے خوشگوار حیرت کا باعث ہوا۔ اردو اور پنجابی کی مسلمہ شاعرہ نے بچوں کی کہانیاں لکھتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی اور آج کے عہد کے بچوں کے لیے آج کے موضوعات پر کہانیاں لکھنے کی طرح ڈالی۔ میرے نزدیک اس عہد کے بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا ایک جوکھم سے زیادہ غیر معمولی ذہنی سطح پر ہوتے ہوئے بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ بدیسی ثقافتی کشش کی یلغار میں اپنے لیے مقام کا پیدا کرنا ہی رخشندہ نوید کی صلاحیتوں کے اعتراف کے لیے کافی ہے۔

میں موضوعات کے علاوہ ان کے کہانی کہنے کے اسلوب اور اخلاقی مواد کو سمونے کے فن سے ازحد متاثر ہوا ہوں۔ وہ چھوٹی سی بات سے ارفع پیغام وضع کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ وہ اخلاقیات کو بچوں پر تھوپنے یا لادنے کے بجائے اس طور ان کی ذہنی دستک کا باعث بناتی ہیں کہ بات جہاں پہنچانی مقصود ہو وہیں تک پہنچے اور پوری اثر انگیزی سے پہنچے۔ رخشندہ نوید کی ادبی شخصیت کا یہ پہلو میری قوم کے بچوں کے لیے بطور خاص اک نوید ہے کہ ہماری تہذیب سے کشید کی ہوئی کہانیاں ہمارے بچوں کی فکری دسترس میں ہوتے ہوئے مینارہ اخلاق و نور ثابت ہوں گی۔

محمد حفیظ خان

کراما کاتبین

پیارے بچوں آج پھر رخشی آپی آپ کے لیے ایک مزے کی کہانی لے کر حاضر ہوئی ہیں۔ بچو یہ کہانی بھی ایک لڑکے کی کہانی ہے جو پانچویں جماعت کا طالب علم ہے۔ بڑا ہونہار، جماعت

میں سب سے سے آگے بیٹھنے کا شوقین سب سے پہلے کلاس ورک مکمل کر کے اپنی ٹیچر کو دکھانے کا عادی! اور سب سے بڑھ کر رضی سب سے زیادہ سوال کرنے میں بھی پیش پیش رہتا۔ کسی بھی نئی بات کی تہہ تک جلدی سے پہنچنے کی کوشش میں اپنے اساتذہ اور والدین کو ہر دم سوالات کی بوچھاڑ سے تقریباً پریشان کر دیتا ___!! لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ سیدھا سیدھا، شریف اور معصوم سا بچہ تھا۔ وہ اکثر اپنی عمر سے بڑی باتیں سوچتا، اُن پر غور کرتا، پھر خود سے الجھتا۔ اور پھر اسی موضوع پر اپنی امّی کا سر کھاتا۔ بہت سی باتیں اور ان کے جوابات اُس کے ذہن میں امی کے ذریعے حاصل ہوتے یا وہ اپنی کتابوں کے مختلف ابواب سے متعارف ہوتیں اور ہر نئی بات سننے اور جاننے پر رضی کا معصوم مگر تیز دماغ اُس موضوع کے بارے میں یکدم بہت کچھ سوچنے بھی لگتا۔ اور جاننے کے لیے بے تاب بھی ہو جاتا۔

ہوا کچھ یوں بچو کہ جس دن سے اُس نے اپنی اسلامیات کی کلاس میں اُن دونوں کے بارے میں سبق پڑھا، تو وہ تو جناب کرسی سے اُچھل اُچھل کر اپنے ٹیچر سے الٹے سیدھے سوالات کرنے لگا۔ اور اُس نے فوراً کہا "ٹیچر یہ کیسے ہو سکتا ہے" یہ کیسے ممکن ہے۔ اُس کی ٹیچر نے اُن دونوں کا مکمل تعارف کرواتے ہوئے اپنی طرف سے رضی کے ذہن میں اُبلتے سوالات کے جواب دیئے مگر کلاس کے ختم ہونے تک رضی کی آنکھیں پھٹی رہیں! اور وہ اپنے ساتھ بیٹھے دوست کی طرف بار بار دیکھتا ___ اپنے کندھے اُچکاتا، حیرت کے دریا میں غوطے لگاتا رہا!

اُس روز گھر پہنچ کر روز کی طرح وہ سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔ اور لگا سوچ بچار کے دھویں میں اُڑنے! اور خود سے سوال پر سوال کرتا رہا، ٹیچر سے پوچھ چکنے کے بعد بھی اس کی سوئی اٹکی ہوئی تھی۔ اُس نے روزانہ کی طرح بڑبڑاتے ہوئے خود سے باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ نلکے کے پانی کی آواز میں اس کی کمنٹری اکثر جاری رہتی تھی ___ آج بھی وہ باتھ روم کے شیشے میں دیکھ کر شکلیں بنا بنا کر بول رہا تھا۔

یہ کیا بات ہوئی۔ یہ سب اخلاقیات کے خلاف" ہے۔ کیوں جی؟ مرے پیارے اللہ تعالیٰ جی آپ نے ہمارے لیے دو باڈی گارڈ رکھے ہوئے ہیں، جو ہر وقت ہماری خبریں لکھتے اور پھر آپ کو پہنچاتے ہیں۔ ایسے چوری چوری کسی کی جاسوسی کرنا بری ہے۔

ایک دم اُسے اپنے کندھے بھاری بھاری لگنے لگے۔ اُس نے کپڑے بدلتے ہوئے شیشے میں دیکھنے کی کوشش کی کہ کیا اُس کے کاندھوں پر فرشتوں کی کوئی صورت بھی اُبھرتی ہے۔

"غلط بات ہے جی بہت غلط بات ہے۔!

اس نے باتھ روم میں تولیے سے منہ صاف کرتے ہوئے اپنے سَر کو ہلایا۔

باہر روزانہ کی طرح رضی کی امّی کھانا گرم کر کے بیٹھی اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔ انھیں معلوم تھا رضی کسی کمنٹری میں مصروف

ہوگا۔ انھوں نے باتھ روم کے باہر آ کر آواز لگائی ''رضی فلم ختم ہوگئی ہے تو باہر آ جا''
باقی سب باتیں شام کی شفٹ میں کر لینا۔
دروازہ پیٹنے پر رضی نے دروازہ کھولا اور خاموشی سے کھانے کی میز پر آ گیا۔'' اُس کی خاموشی سوگھ کر اُس کی امّی نے ہنس کر کہا'' کیا ساری باتیں باتھ روم میں ہی ختم ہوگئیں۔
'' کیسا گزرا آج کا دن۔ مینتھ کے ٹیسٹ میں کتنے نمبر آئے۔'' رضی نے امّی کی بات کا مختصر سا جواب دیا اور جواب دے کر ایک دم اس موضوع پر آ گیا جس نے اُس کے ذہن میں کھلبلی مچا رکھی تھی۔
اگلا نوالہ منہ میں ڈالنے سے پہلے اُس نے اپنا ہاتھ روکا اور اُٹھ کر امّی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اور سرگوشی میں بولا امّی کیا وہ دونوں آپ کا اعمال نامہ بھی لکھ رہے ہیں ہیں آپ کی بھی سب باتیں ریکارڈ ہو رہی ہیں؟ اُس کی امی نے اُس کے دونوں ہاتھ پیار سے تھام لیے اور پیار سے ہنستے ہوئے بولیں، تو کیا آج اسلامیات میں وہ سبق پڑھا ہے۔ جس میں کراماً کاتبین کا ذکر ہے۔ ہمارے دو اہم ترین فرشتے جو ہر انسان کے تمام قول و فعل رجسٹروں میں درج کرتے ہیں جی، جی! رضی حیرت سے منہ کھولے کھڑا تھا۔
اُس کی امی نے اُسے کہا کھانا کھاؤ میں بتاتی ہوں اور اس کی امی رضی کی باتوں کو دلچسپی سے سنتی رہیں اور دھیرے دھیرے اُن کے جواب دیتی رہیں۔ رضی نے پوچھا اگر ہمارے دائیں بائیں کاندھوں پر فرشتے موجود ہیں تو ہمیں اُن کا بوجھ کیوں محسوس نہیں ہوتا۔ پھر پوچھا وہ اتنا سب کچھ، سب کے بارے میں کیسے لکھ لیتے ہیں۔ پھر انھیں کیسے ہزاروں، لاکھوں کروڑوں رجسٹروں میں بھرتے ہیں۔ تو اُس کی امّی نے اسے بڑی اچھی مثال دے کر سمجھایا۔ کہ دیکھو رضی۔ ہمارے کمپیوٹر، ہمارے فون، ہماری USB یا پھر ایک چھوٹی سی چپ میں ہم کتنا مواد محفوظ کر لیتے ہیں۔ رضی کی امّی نے کہا، تو لگتا یہی ہے اللہ تعالیٰ نے کچھ اسی طرح کا نظام بنایا ہوا ہے۔ یہ دونوں فرشتے ہر انسان کا اعمال نامہ تیار کرتے رہتے ہیں ہو سکتا ہے روز جزا کسی بڑی سکرین پر ہر شخص کا ریکارڈ شدہ ڈیٹا اوپن کیا جائے اور وہ اُس کو دکھایا جائے کہ دیکھو تم نے دنیا میں اتنے اچھے کام کیے اور کتنے برے کام''۔
لیکن امّی جی اتنی آزادی تو ہونی چاہیے کہ بندہ جو کرنا چاہے وہ کرے اور کسی کو پتہ نہ چلے۔
امّی میں تو روز منصوبے بناتا ہوں وہ جو سیکشن گرین کے لڑکے ہیں ان کے ساتھ کرکٹ کھیلوں گا تو زور سے بال اُن کے منہ پر دے ماروں گا۔ ''ش ش ش'' اُس کی امّی نے رضی کے ارادے سن کر کہا۔ ماما انھوں نے بھی تو جان کر کھیلتے ہوئے پاؤں میرے آگے رکھ کر مجھے بری طرح گرایا تھا۔ اُس کی ماما نے کھانا ختم ہونے پر اُسے کھانے کی میز سے اُٹھایا۔ اور اسکے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اُسے اُس کے کمرے میں لے گئیں اور بتاتی بھی رہیں۔

دیکھو رضی ایک مزے کی بات ہے اس نظام قدرت میں! آپ جب تک کوئی برائی کر نہیں لیتے۔ صرف سوچتے ہو یا برے کام کا ارادہ بناتے ہو تو اس کا کوئی کھاتہ نہیں اُس کو درج نہیں کیا جاتا لیکن پھر بھی تم اپنے ذہن میں ایسے منصوبے مت بنایا کرو۔

اس کی امّی نے اُسے چادر اُڑھا کر بستر میں آرام کرنے کے لیے لٹایا اور بولیں لیکن نیکی کرنے کا اگر تم سوچو گے بھی، صرف منصوبہ ہی بناؤ گے بھلے ابھی نیک کام کیا بھی نہ ہو تو وہ فوراً درج ہو جائے گی اور کراماً کاتبین فوراً دیکھ لیں گے کہ اللہ کے بندے نے نیک کام کی نیت کی ہے۔ واقعی؟ امّی یہ تو سچ میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی بات ہے۔ اماں ویسے آپ ہیں بڑی چالاک۔ یہ دونوں فرشتے کراماً کاتبین بھی آپ جیسے ہیں۔ آپ کو یاد ہے نا!

امی کمرے میں پردے گرا رہی تھیں اور رضی بولے جا رہا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں کلاس اول میں ہوتا تھا تو آپ کہا کرتی تھیں اگر لنچ کھاؤ گے نہیں کسی باسکٹ میں پھینک آؤ گے تو میں نے جو کیمرے لگا رکھے ہیں۔ جو میری آنکھوں میں لگے ہیں، وہ دیکھ لیں گے کہ تم نے لنچ خود کھایا ہے یا پھینک دیا ہے۔۔ میری آنکھوں کو خبر لگ جائے گی انھیں پتہ چل جائے گا ماں آپ کو معلوم ہے میں کوئی بھی غلط کام کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا کرتا کہ امی کا کیمرہ کدھر ہے کیمرے کی آنکھ مجھے دیکھ رہی ہے۔ رضی ہنس رہا تھا۔ مجھے پتہ ہے وہ دونوں پیارے فرشتے کراماً کاتبین آپ کے جیسے ہیں۔ چھپ چھپ کر مری خبر رکھتے ہیں۔ آپ ایسے ہی مجھے بچہ سمجھ کر کہا کرتی تھیں نا؟

رضی کی امّی نے کہا_ میری جان تو ابھی بھی بچہ ہی ہے، میرا چھوٹا سا بچہ۔!

رضی کی امّی نے لائٹ آف کر دی تا کہ رضی ایک گھنٹہ سو جائے اور اس کے اُلجھے ذہن کو سکون مل جائے_ اُٹھ کر رضی نے ہوم ورک کرنا تھا اور پھر فٹ بال کھیلنے جانا تھا۔

امّی کے کمرے سے نکلتے ہی رضی کی کنٹری شروع ہو گئی۔ اور ذہن میں وہ پھر ان دونوں اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کے بارے میں ان کی جسامت، ان کے قلم، ان کی تختی جسے لوح کہا جاتا ہے سب کے بارے میں سوچنے لگا۔

نیند دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں بھری تو اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کندھے تھپتھپائے اور آنکھیں موندے موندے بولا

"لگے رہو منا بھائی___"

"لگے رہو"

تو پیارے بچو کیسی لگی آپ کو آج کی کہانی___

اس کہانی کا مطلب یہی ہوا کہ ہمیں نیک کام کرنے چاہئیں اور بری باتوں کے بارے میں سوچنے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔ اللہ نگہبان و حامی و ناصر

☆☆☆☆☆

رخشندہ نوید

لاہوری ادبی سرکل کا عینی شاہد ___ ہمایوں پرویز شاہد

ہمایوں پرویز شاہد کا پہلا تعارف غزل کے ذریعہ ہوا۔ بعد از مشاعرہ محترم اقبال راہی صاحب نے تعارف کروایا پھر رفتہ رفتہ ادبی تنقیدی، اجلاس میں ہمایوں پرویز شاہد سے ملاقات ہوتی رہی، ہنسی مذاق کرنے والا شخص ہمایوں پرویز شاہد کچھ عرصے کے لیے غائب ہو گیا۔ پھر اپنے نئے حلیہ کے ساتھ ظاہر ہوا۔ سر پر ٹوپی، آنکھیں نیچی، آواز دھیمی اور باقاعدہ خط کشیدہ ڈاڑھی نے مجھے حیران کیا۔ مگر اگلے ہی لمحے ہمایوں صاحب مخاطب ہوئے۔ رضوی صاحب میں عمرے تے گیا سی، کل ہی واپس آیا واں۔ میں نے مبارک باد دی، گلے لگایا، ہمایوں صاحب نے کچھ تبرک اور ایک کتاب مجھے عطا کیا۔ اور کہا اے نعتاں دی کتاب اے۔ ''میلاد کا موسم'' اللہ تعالیٰ دا بڑا کرم ہویا میں اے مکمل کرلئی تسی کچھ لکھو'' میں نے وعدہ کیا اور آج موقع بھی مل گیا، سو یہاں حاضر ہوں اور ہمایوں پرویز شاہد صاحب کو کتاب کی اشاعت پر تحریراً مبارکباد پیش کر رہا ہوں۔

اس اُردو مجموعہ نعت سے پہلے پنجابی زبان میں نعتوں کے دو مجموعے ''دیوے بال درواں

اعجاز رضوی

دے" "اور عطا قرنعت ہوئی اے" منظر عام پر آچکے ہیں۔ "میلاد کا موسم" اُردو نعت میں ایک اضافہ ہے، اور وہ بھی ایسا اضافہ جس سے نعت خواں حضرات بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اس مجموعے میں بہت سی نعتیں ایسی ہیں جنکی طرز اور الفاظ کی بندش پڑھنے والے کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کرتی ہیں وہ کہتے ہیں:

کیا خوب صلہ مجھ کو محبت کا ملا ہے
پہچان مری سرور عالم کی ثنا ہے

.....

جنت کے سوا اور نہ جائے گا کہیں وہ
سرکار کی سنت پہ جو انسان جیا ہے

.....

یہاں میں ایک بار پھر دہرادوں کہ ہمایوں پرویز شاہد کا پہلا تعارف اور پہلا حوالہ غزل ہے، اس لیے اُن کی تمام نعتیں غزل کی طرز پر لکھی گئی ہیں۔

ترنم اور کیفیت میں ڈوبی ہوئی نعتیہ لائنیں ایمان کو تازہ کرتی ہوئی گزرتی ہیں۔

وہ کہتے ہیں:

انہی کے ذکر سے امید کا سورج چمکتا ہے
انہی کے ذکر سے شاہد اندھیری رات ڈھلتی ہے

.....

کام بنتا گیا ٹلی مشکل
جب بھی کی ابتدا درودوں سے

دیکھنے آئیں گے نبیؐ شاہد
دل کا گلشن سجا درودوں سے

.....

ہمایوں پرویز شاہد ایک انسان ہی نہیں، بلکہ ایک بہتر انسان ہیں۔ ادب، ادب دوستی، شاعری، اور شاعران کی زندگی کے ستون ہیں اور ان ستونوں پر انھوں نے انکساری کی چادر تانی ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ اندرون شہر بھاٹی گیٹ کے رہائشی ہوتے ہوئے بھی، دودھ، دہی، لسی، مکھن، کھیر اور دیگر کھابوں کی باتیں کرنے کے بجائے علم و ادب کی بات کرتے ہیں اور خود کو شاعری میں مگن رکھتے ہوئے، دوسروں کو بھی یہی سبق دیتے ہیں کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرو اور اپنی زندگی آسان بناتے جاؤ۔ میں ہمایوں پرویز شاہد کو ان کے نام کی طرح تین توانا مردوں کی طاقت سمت دیکھتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ یہ ہمیشہ ادبی کام کرتے رہیں اور اس لمحہ موجود کے ادبی ماحول اور ادبی سفر کے عینی شاہد بھی بنے رہیں۔ کہ ان جیسا سچا انسان ہی عینی شاہد کے رتبے پر سجتا ہے۔

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورگورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

جب بھی کوئی ممبر اسمبلی یا بااثر آدمی سفارش کرے اسے غور سے سنیں اور اس کی موجودگی میں اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیں۔ نفسیاتی طور پر اس کی تسلی ہو جائے گی کہ صاحب نے نوٹس لے لیا ہے، یہ نہیں کہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا ہے۔ سفارشیں عمومی طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں۔ مقدمات کے سلسلے میں یا تبادلوں کے متعلق۔ جہاں تک مقدمے کا تعلق ہے تو وہ کسی فریق کے حق یا مخالفت میں ہوگی۔ یہ سنتے ہی آپ بپھر جائیں گے تو پھر اس کے گھر پہنچنے سے پہلے آپ کو بوریا بستر باندھنا پڑے گا۔ حکومت یہ تو برداشت کر سکتی ہے

کہ کسی ممبر کا کام نہیں ہوا لیکن اس کی بے عزتی برداشت نہیں کرتی۔ اگر سیالکوٹ کا شیخ اعجاز ٹائپ کوئی ممبر ہے تو ہوسکتا ہے وہ باہر جانے سے انکار کردے اور اُلٹا آپ کی بے عزتی کر دے۔ اکثر ممبر اپنے ساتھ بندوق برداروں کا ایک جتھہ رکھتے ہیں۔ یہ اعجاز صاحب وہی ذات شریف ہیں جنہوں نے اسماعیل قریشی سیکرٹری صحت کو تھپڑ جڑ دیا تھا۔ راؤ رشید سیکرٹری اری گیشن کے گلے میں گائیوں کا ہار ڈال دیا تھا۔ آپ اسے کہیں، میں نے نوٹ کرلیا ہے۔ مشل نہیں دیکھی اللہ تعالیٰ بہتری کرے گا۔ اس دن تاریخ ڈال دیں نوے فیصد کیسوں میں وہ آپ کو دوسری یا تیسری بار سفارش نہیں کرے گا۔ وقتی طور پر کسی حمایتی کے ایما پر وہ آپ کو چٹ تھما دیتا ہے۔ مقدمے کا میرٹ پر فیصلہ کردیں۔ پچاس فیصد تو ویسے ہی اس کے حق میں ہوسکتا ہے ضروری نہیں کہ غلط کام کی ہی سفارش کی جائے۔ بعض لوگ بطور حفظ ماتقدم بھی سفارش کرا لیتے ہیں، مبادا مخالف فریق ہاتھ دکھا جائے۔ جہاں تک کسی اہلکار کے تبادلے کا تعلق ہے تو کرنا بھی ہو تو فوری طور پر نہ کریں۔ کیونکہ اس صورت میں اس نے دوسری سفارش تیار کر رکھی ہوتی ہے۔ وقفہ دیں۔ اس اہلکار کی شہرت دیکھیں۔ اگر بری شہرت نہیں رکھتا تو ایک دو ماہ بعد اسے تعینات کردیں۔ ویسے بھی Lucrative posts پر Rotation Policy اختیار کرنی چاہئے۔ تبادلے کے بعد اس ممبر کو اتنی بار یاد کرائیں کہ کچھ عرصہ تک ممنونیت کے بوجھ تلے دبا رہے اور دوسری سفارش سے حتی الوسع گریز کرے۔

کام ہو نہ ہو چائے کی پیالی پلائے بغیر کسی کو واپس نہ بھیجیں۔ نہ پینے کی صورت میں ایک تو اس کی انا مجروح ہوگی اور پھر لامحالہ وہ یہ تاثر لے گا کہ یا آپ اس سے ناراض ہیں یا کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ کبھی کبھی سب ممبروں کو گھر دعوت پر بلا لیں۔ ڈپٹی کمشنر ہاؤس میں دعوت کا تصور ہی بڑا جانفزا ہوتا ہے۔ ویسے بھی آپ علاقے میں جا کر اگر ان کے دس کھانے کھاتے ہیں تو ایک آدھ ''ریٹرن ڈنر'' آپ پر لازم ہو جاتا ہے۔

کسی صورت میں بھی ظلم یا زیادتی نہ کریں۔ چاہے اس کے لئے آپ کو کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ تکریم انسانیت کا خاص خیال رکھیں۔ خوشامد سے بھی حتی الوسع گریز کریں اس لئے نہیں کہ یہ کوئی خاص بری چیز ہے بلکہ اس وجہ سے کہ یہ ایک فن ہے جو ہر کسی کو نہیں آتا۔ انا ڈی فوراً پکڑا جاتا ہے اور اکثر ممدوح سے جھاڑ کھاتا ہے۔ اس کے لئے چرب زبانی کے

علاوہ Sense of timing بھی ہونا چاہئے۔ بے وقت کی راگنی کسی کو بھی نہیں بھاتی۔ جس طرح گانا بغیر آرکسٹرا کے نہیں گایا جاتا اسی طرح خوشامد کے وقت چند دیگر مدح خوا بھی ہونے چاہئیں جو ہنکارا بھرتے رہیں۔ ہمارے ہاں خوشامد کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ جو لوگ دوسروں کو یہ کہہ کر مطعون کرتے ہیں کہ وہ بڑا ''خوشامدی'' ہے وہ خود اس قسم کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ پھر عجیب بات ہے کہ چھوٹا آدمی تعریف کرے تو اسے نفرت سے خوشامد کہا جاتا ہے اور یہی کام اگر بڑا آدمی کرے تو اسے کمال فن گردانا جاتا ہے۔

چیف سیکرٹری پرویز مسعود جب اپنے چکنے سر پر کرکٹ کی ٹوپی رکھے ایمپائرنگ کرتا تھا تو میاں نواز شریف کو سنچری مکمل کرنے سے پہلے بھول کر بھی آؤٹ نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کو آپ کس مد میں ڈالیں گے؟ اگر یہ سب کام نہیں کر سکتے تو آپ کو کسی حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ فیلڈ کی نوکری کریں۔ آرام سے سیکرٹریٹ میں بیٹھیں اور دن رات فیلڈ افسروں کی روش اور چال چلن کے بخیے اُدھیڑتے رہیں۔

ملزم فلم اسٹار: ہفتے میں تین دن عدالتی امور کے لئے وقف تھے۔ زیادہ کام محکمہ مال کا تھا۔ فوجداری مقدمات کم تھے۔ ایک دن میں اپنے چیمبر میں عدالت کر رہا تھا کہ غیر قانونی شکار کے سلسلے میں ایک ملزم آیا جس کی شکل کچھ جانی پہچانی سی لگتی تھی۔ اُس کے دائیں بائیں دو نوجوان اور خوبصورت عورتیں تھیں جن کے بال کھلے تھے اور انہوں نے آدھی آستینوں کے کڑھائی والے کرتے پہن رکھے تھے۔ میں نے اس کا نام پوچھا تو بڑی حیرت سے بولا ''آپ میرا نام نہیں جانتے! کیا آپ پاکستانی فلمیں نہیں دیکھتے؟'' یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا ''اوّل تو میں پاکستانی فلمیں نہیں دیکھتا کہ سب ایک جیسی بری ہوتی ہیں۔'' دوسرا I am not suppose to know your name اور آخری بات یہ ہے کہ تم کس کی اجازت سے کرسی پر بیٹھے ہو۔ فوراً کھڑے ہو جاؤ کیونکہ یہ کرسیاں ملزموں کے بیٹھنے کے لئے نہیں رکھی گئی ہیں۔'' وہ کھڑا ہوا تو تھر تھر کانپنے لگا اور پسینہ اس کے بوسکی کے کرتے سے صاف جھانک رہا تھا۔ وہ فلم سٹار شاہد تھا۔ عکس بندی کرتے وقت چونکہ یہ ہر قسم کے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اس لئے چولستان میں شوٹنگ کے وقت اسے خیال نہ رہا کہ حقیقی زندگی میں قانون مختلف ہوتا ہے۔ اس کا مقدمہ کافی دیر تک چلا۔ میاں والی قریشیاں کے مخدوموں نے سفارشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ ان کی رنگین مزاجیاں سارے علاقے میں مشہور تھیں۔

جب میں نہ مانا تو کسی نے انہیں مشورہ دیا کہ ڈی سی کی منتیں کرنے کی بجائے استغاثہ کے گواہوں پر توجہ دو۔ جب بنیاد ہی ہل جائے تو عمارت کیسے کھڑی ہو سکتی ہے۔ تمام گواہ منحرف ہو گئے۔ وطن عزیز میں بااثر آدمی اکثر بچ جاتے ہیں۔ ہر جرم ثابت کرنے کے لئے موثر شہادت ضروری ہوتی ہے۔ جو اکثر دستیاب نہیں ہوتی۔ شاہد بری ہو گیا تو دوسرے دن مخدوم عمادالدین اسے میرے پاس لے آیا۔ شاہد کہنے لگا ''آپ نے سفارش نہیں مانی۔ اس کی مجھے خوشی ہے۔ بری میں اپنی قسمت سے ہوا ہوں آپ کی مہربانی سے نہیں ہوا۔ بائی دی وے میں لاہور میں آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ بڑی Exclusive دعوت ہوگی۔ آپ نے اس دن میرا Standard تو دیکھ لیا ہوگا، اس معاملے میں بہت Choosy ہوں۔''

میں نے ہنس کر کہا ''جس دن میں نے سرکاری نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور فلم انڈسٹری جوائن کرنے کی خواہش پیدا ہوئی میں تمہاری خدمات سے ضرور استفادہ کروں گا۔''

کیا خون پانی سے زیادہ گاڑھا ہوتا ہے؟

ایک شام احمد محمود کا چھوٹا بھائی اکبر محمود میرے پاس گھر آیا۔ بڑا گھبرایا ہوا تھا اور غصے میں لگتا تھا۔ میں نے کہا ''اکبر میاں! خیریت تو ہے؟ آج تمہارے تیور کچھ اچھے نہیں لگتے۔'' کہنے لگا ''انکل! میں نے حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔''

''کس چیز کا؟''

بولا ''میں نے احمد کو نہیں چھوڑنا۔ میں اسے گولی مار دوں گا۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ مجھے قتل کروانا چاہتا ہے۔ دوستوں اور رشتہ داروں نے مشورہ دیا ہے کہ Before he takes on you, get rid of him.''

''تو میرے پاس کیا لینے آئے ہو''

''ایک تو آپ کو مطلع کرنے اور دوسرا جب میں پکڑا جاؤں تو مجھے جیل میں 'اے' کلاس ملنی چاہئے۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔ کس قدر معصوم خواہش تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی کہے کہ جب میں دوزخ میں جاؤں تو جس جگہ مجھے رکھا جائے اس کمرے کی ایک کھڑکی جنت کی طرف کھلنی چاہئے۔ مجھے ان بھائیوں کے اختلافات کا تو علم تھا لیکن یہ خبر نہ تھی کہ نوبت بایں جا رسید! احمد محمود کو غلام میراں شاہ سیاست کے من جملہ اسرار و رموز سے تو آگاہ نہ کر سکا تھا لیکن زمیندارانہ طور طریقے سمجھا گیا تھا۔ بڑے زمیندار گھرانوں میں 'پرنس آف ویلز' کو جو اہمیت حاصل ہوتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ بڑا بیٹا ہی ہر کام کا کرتا دھرتا ہوتا ہے۔ احمد محمود نے کمال ہوشیاری سے اپنے پاس تو ایک سو بیس مربع

زمین رکھ لی تھی اور چھوٹے بھائی کو بیس مربعوں پر ٹرخا دیا۔ چونکہ باپ اور دادا یکے بعد دیگرے چل بسے تھے اس لئے اُسے کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا تھا۔ خوش قسمتی سے حسن محمود نے ساری زندگی دولت کمانے کے لئے جو جدوجہد کی تھی اس کا ثمر بھی احمد کو ملا۔ حسن محمود ایک اعتبار سے تنگ دست رہا۔ شاہ خرچ انسان تھا لیکن باپ کا محتاج تھا۔ اس نے بڑی محنت سے پندرہ سال کے عرصے میں کراچی میں سرکاری زمین پر ایک کالونی بنائی۔ جب پلاٹوں کی فروخت کا وقت آیا تو وہ چل بسا۔ اسی طرح لندن اور نیویارک میں اس کے مکان تھے۔ جب ان فلیٹوں کی آخری قسط ادا ہوئی تو اس نے آنکھیں موند لیں۔ احمد کی بلی کے ہاتھوں صرف چھینکا نہ ٹوٹا تھا بلکہ دولت کا بہتا ہوا دریا اس کی دہلیز تک آن پہنچا تھا اور اس میں وہ بھائی کو شریک نہ کرنا چاہتا تھا۔ پیر پگاڑا کی مدد سے احمد نے کالونی پر بھی قبضہ کر لیا اور سارے پلاٹ بیچ ڈالے۔ یوسف رضا گیلانی اور پیر پگاڑا کی جوز مین غلام میراں شاہ نے اپنی زندگی میں ہبہ کی تھی وہ بھی اس نے اونے پونے خرید لی۔

معاملہ خاصا سنگین تھا۔ میں نے اکبر کو سمجھایا کہ وہ اس حرکت سے باز رہے۔ اس صورت میں اسے زمین تو کیا ملنی ہے ملی ہوئی سے بھی محروم ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ میں نے وعدہ کیا کہ اسے مزید زمین دلواؤں گا۔ احمد کو بلا کر میں نے تمام مضمرات سے آگاہ کیا۔ وہ بادل نخواستہ کچھ زمین اور رقم دینے پر راضی ہو گیا۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی کے مصداق اکبر بھی وقتی طور پر خوش ہو گیا۔

ویسے تو ڈپٹی کمشنر کی چوبیس گھنٹے کی ملازمت ہے اور ہر وقت کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا رہتا ہے۔ اشیائے خورد و نوش کی قیمتیں چڑھ جائیں تو فوراً بازپرس ہو جاتی ہے کہ اتوار بازاروں کو ٹھیک طور سے منظم نہیں کیا گیا۔ اگر گندم کی فصل کم ہو تو اس کے حصول کے لئے زمینداروں کے گوداموں پر مجسٹریٹوں کے ذریعے چھاپے مروانے پڑتے ہیں۔ گنا، ملوں تک نہ پہنچے یا ملز مالکان بروقت ادائیگی نہ کریں تو ان کے کان مروڑنے پڑتے ہیں۔ ملوں میں مالکان اور مزدوروں میں جھگڑا ہو جائے تو آجر اور اجیر کے درمیان تصفیہ بھی ڈی سی ہی کراتا ہے۔ علاقے میں جرائم بڑھ جائیں تو اس کی ذمہ داری بھی ڈی سی بہادر کے کندھوں پر پڑتی ہے۔ حکومت کے مختلف محکموں میں تعلقات کار کی ذمہ داری بھی اسی ذات شریف کی ہوتی ہے۔ وہ بلحاظ عہدہ ڈسٹرکٹ کوآرڈی نیٹر ہے۔ مختلف منصوبوں کی بروقت تکمیل اشیاء خورد و نوش کی ہر ماہ قیمتیں مقرر کرنا اور ان پر سختی سے

عملدرآمد کرانا بھی اسی کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ مالئے کی بروقت وصولی، مقدمات کی بھرمار کو کم کرنا بھی اس کے من جملہ فرائض میں شامل ہے۔ دن کو ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا اور سرِشام ہی لاہور سے کالیں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ وزیراعلیٰ چیف سیکرٹری اور کمشنر وقت بے وقت کچھ نہ کچھ پوچھتے ہی رہتے۔ جو جھاڑ وزیراعلیٰ سے چیف سیکرٹری کو پڑتی ہے وہ فوراً ہی اسے کمشنر کو منتقل کر دیتا ہے۔ کمشنر بھی اپنے پاس کچھ نہیں رکھتا نہایت ایمانداری سے بلا کم وکاست وہ امانت نیچے روانہ کر دیتا ہے لیکن دو چیزیں ایسی ہیں جن کے لئے عملاً سارا سال تیاری کرنی پڑتی ہے اور وہ ہیں، محرم اور سیلاب۔

گھن کی صورت یہ تعصب تجھے کھا جائے گا: ضلعی انتظامیہ کو عاشورہ محرم کو ہر چیز پر فوقیت دینا پڑتی ہے۔ اسلامی سال کا آغاز اس ماہ سے ہوتا ہے۔ اگر خدانخواستہ اس مہینے میں کوئی گڑبڑ ہو جائے تو پھر پورا سال آرام سے نہیں کٹتا۔ چودہ سو سال پہلے محسن انسانیتؐ نے جب دین مبین کا اعلان کیا تو اس وقت صرف ایک ہی فرقہ تھا، مسلم۔ ہم نے اس عرصے میں اسے بہتر ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔ مسالک کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات تو نہیں ہے۔ عیسائیوں میں بھی فرقے رہے ہیں۔ انہوں نے خوش اسلوبی سے اس مسئلے کو حل کر لیا ہے۔ ان کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ صرف ایک ہے، قوتِ برداشت۔ دوسرے کی بات تحمل سے سننے کا حوصلہ۔ کہنے کو تو ہم بھی اکثر نعرہ زن رہتے ہیں کہ اپنا مسلک مت چھوڑو دوسرے کے مسلک کو مت چھیڑو! لیکن اس پر عمل نہیں کرتے۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ایک فریق دوسرے پر اپنا نظریہ مسلط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی ذمہ داری کافی حد تک مذہبی لیڈروں پر بھی ہوتی ہے۔ وہ چاہے ذاکر ہو یا مولوی۔ اگر اپنے مسلک کا پرچار کرنے کی بجائے دوسرے پر وار کرے گا اور جذبات کو اُبھارے گا تو پھر لامحالہ خرابی پیدا ہوگی اور امن امان کا مسئلہ کھڑا ہوگا۔ گو محرم کے جلوس کے روٹ، اوقات اور منازل پہلے سے طے ہوتی ہیں اور فریقین کو تحریری طور پر اس کا پابند بھی کیا جاتا ہے لیکن بہانہ سازوں اور تخریب کاروں کے پاس مسلمانوں کو لڑانے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں انتظامیہ ہر سطح پر علمائے کرام کی میٹنگیں بھی کرتی ہے۔ ضابطہ اخلاق بھی مرتب کیا جاتا ہے۔ صوبائی سطح پر وزیراعلیٰ خود اُن سے خطاب کرتا ہے۔ پولیس اور انتظامیہ کی چھٹیاں منسوخ کر کے انہیں ہائی الرٹ پر رکھا جاتا ہے۔ جذبات

بھڑکانے والے واعظین پر ضلع میں آنے کی پابندی لگائی جاتی ہے۔ بلکہ بعض لوگوں کو تو ضلع بدر بھی کرنا پڑتا ہے۔

محرم کے دنوں میں انتظامیہ کی سانس حلق میں اٹکی ہوتی ہے۔ امن وامان کے علاوہ یہ ڈی سی کی انتظامی صلاحیتوں کا بھی امتحان ہوتا ہے۔ مجھے رحیم یار خان میں آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ محرم تو کسی طور آرام سے کٹ گیا لیکن چہلم میں ایک افتاد آن پڑی۔ علی الصبح اے سی خانپور طارق باجوہ نے فون پر اطلاع دی کہ رات کو کسی شخص نے مقامی مسجد کی بے حرمتی کی ہے۔ صحن میں قرآن شریف کے اوراق بکھرے پڑے ہیں۔ لوگوں میں بڑا اشتعال ہے۔ ہزاروں کا مجمع جلوس نکال کر شہر کے بازاروں اور گلی کوچوں سے گزرے گا اور اس طرح لامحالہ چہلم کے جلوس سے ٹکرائے گا۔ یہ ایک طرح سے اظہار بے بسی تھا۔ میں اسے وہ جواب نہ دے سکتا تھا جو میاں فیض کریم ڈی سی شیخوپورہ نے مجھے لکھ کر بھیجا تھا۔ میں ایس ایس پی کو لے کر فوراً موقع پر پہنچا۔ اس وقت نعرے مارتا اور ڈنڈے لہراتا ہوا جلوس بازار میں داخل ہو چکا تھا۔ ان کو یہیں روکا جائے۔ میں نے ایس پی کو کہا ''لیکن کیسے؟''

ایس پی انعام الرحمٰن سحری حیران ہوتے ہوئے بولا ''ہماری موجودگی ان کے لئے Red Rag ثابت ہوگی۔ ہماری اپنی سیکورٹی داؤ پر لگ جائے گی۔ مشتعل لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔'' عام حالات میں سحری کا استدلال درست تھا لیکن وہ سوچنے کا مقام نہیں تھا۔ میں بلاخوف ہجوم میں شامل ہو گیا۔ ان کے ساتھ تھوڑا سا مارچ کیا، چند نعرے بھی لگائے اور اس طرح نفسیاتی طور پر انہیں باور کرایا کہ میں بھی ان میں سے ہوں۔ جب ہم مرکزی بازار کے چوک پر پہنچے تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو روک دیا۔ سب سے پہلے میں نے ان کے لیڈروں کو دعوت دی کہ وہ دکان کے تھڑے پر کھڑے ہو کر اظہار خیال کریں۔ چند تقریریں ہوئیں۔ جذباتی، سلگتی ہوئی اشتعال انگیز۔ آخر میں میری باری آئی۔ سحری پریشان کن نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا ''عزیزانِ نیک نام! آج ہر آنکھ اشکبار ہے۔ ہر دل رو رہا ہے اور عوام کا غصہ ایک طوفان کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ جو شخص توہین اور تکفیر کا مرتکب ہوا ہے اسے ابھی، اسی وقت اس چوک میں پھانسی دے دی جائے۔''

''ہاں، ابھی اسی وقت'' تمام لوگ بیک آواز پکار اُٹھے۔ میں نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''صرف پھانسی نہ دی جائے بلکہ اس کی لاش کو کوڑے بھی مارے جائیں''

''ہاں، ہاں ضرور کوڑے مارے جائیں'' ایک مرتبہ پھر شور بلند ہوا۔

''اور اس کا گوشت کتوں، کووں اور چیلوں کو کھلا دیا جائے۔''

''ہاں ہاں ایسا ضرور کیا جائے۔ سارے کا سارا'' لوگوں نے تائید کے ساتھ تجویز بھی دے دی۔

''لیکن وہ بدبخت ہے کہاں؟'' میں نے بآواز بلند پوچھا۔ لوگوں نے بے خیالی میں ادھر اُدھر دیکھا۔ ''کوئی ہے جو اسے تلاش کر کے لے آئے''

یکدم مکمل سکوت چھا گیا۔ ''نہیں۔ یہ آپ کا نہیں انتظامیہ کا کام ہے۔ ہم اس مردود کو تلاش کریں گے۔ اسے دھرتی کی کوکھ سے نکال لائیں گے۔ آپ ہمیں صرف ایک دن کی مہلت دیں۔''

''ایک دن کی مہلت۔ بس صرف ایک دن کی مہلت۔'' ہر شخص زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ سارا مجمع بیک وقت بول اُٹھا اور اس طرح اس نفسیاتی فضا میں ایک انتظامی مسئلہ حل ہو گیا۔ اگر اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر انہیں روکا نہ جاتا تو سارا شہر فرقہ واریت کی آگ میں جل اُٹھتا۔ مسلح تصادم ہوتا اور لاشیں اُٹھانے کے لئے رینجرز منگوانے پڑتے۔ شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے جولیس سیزر میں مارک انٹونی کی تقریر کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی کہ لوگوں کے جذبات بھڑکائے کیسے جا سکتے ہیں۔ کاش وہ کسی ڈرامے میں یہ بھی سکھا جاتا کہ بھڑکے ہوئے جذبات کو سرد کیسے کیا جا سکتا ہے۔

دراصل وہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ جب تخریب کارنا کام ہو گئے تو انہیں نے پلان 'بی' پر عمل کرنے کی ٹھانی۔ چہلم کا جلوس شیعہ حضرات نہیں بلکہ ایک سنی دانے شاہ نکالتا تھا۔ جلوس اپنے متعین روٹ پر چلتا ہوا منزل کے قریب پہنچا تو دانے شاہ جلوس سے نکل کر محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے گیا۔ وہ نماز پڑھ کر نکل ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کے سر پر ڈنڈوں سے بھرپور وار کیے۔ بوڑھا آدمی تھا چکرا کر گرا اور وہیں دم توڑ دیا۔ پولیس نے مسجد کو گھیرے میں لے لیا۔ نمازی، اہل محلہ یا راہگیر، کوئی بھی بتانے کے لئے تیار نہیں تھا کہ حملہ آور کون لوگ تھے۔ مفسدوں کا پلان بی بھی فیل ہو گیا۔ انہوں نے ایک بے گناہ شخص کو تو مار ڈالا لیکن فرقہ واریت کی آگ نہ بھڑکا سکے۔ میری موجودگی میں شاید یہ ممکن نہ تھا۔ جلوس شیعوں کا تھا مارا ایک سنی العقیدہ شخص گیا تھا۔ جلوس نہ رکا اور اپنی منزل پر جا کر عین وقت پر اختتام پذیر ہوا۔

انہی دنوں مجھے کمشنر ملک عبدالمجید کا فون آیا اور رحیم یار خان میں آئے ہوئے ایک ڈاکو کی گرفتاری کا حکم دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو

بولے "وجہ تو مجھے بھی نہیں معلوم - ہوم سیکرٹری حاجی محمد اکرم نے کہا ہے کہ اسے گرفتار کرلیا جائے۔"

میں نے انکار کیا تو بولے "بہتر ہے حاجی صاحب سے بات کرلو۔" جب میں نے ہوم سیکرٹری کو فون کیا تو پوچھنے لگے "وہ ذاکر گرفتار ہوگیا ہے؟"

"نہیں تو"

غصے سے بولے "حکم کی تعمیل کیوں نہیں ہوئی۔ کہیں روپوش تو نہیں ہوگیا؟"

عرض کیا "ادھر ہی ہے۔ فرد جرم کیا لگانی ہے؟"

کہنے لگے "اس نے بڑی قابل اعتراض تقریر کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جب رسالت مآب معراج پر گئے تو وہاں حضرت علی موجود تھے۔"

میں نے جب انہیں بتایا کہ "ایسا کہنا کسی تعزیر میں نہیں آتا۔ کیونکہ This is fundamental of shia theology اس سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن کسی کی سوچ پر پہرے بٹھائے جا سکتے ہیں اور نہ زبان بندی کی جاسکتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مقامی علماء نے اس پر احتجاج نہیں کیا ہے۔ ہماری مسلم اُمہ میں تو اس بات پر بحث ہوتی رہتی ہے کہ معراج جسمانی تھا یا روحانی!"

بڑے جز بز ہوئے کہنے لگے "اب تم مجھے روحانیات کے بنیادی اصول سکھلاؤ گے۔ آج شام تک وہ گرفتار ہوجانا چاہئے۔"

میں نے جب دوبارہ انکار کیا تو بولے "لکھ کر بھیج دو" ان کا خیال تھا میں اس دھمکی سے ڈر جاؤں گا۔

میں نے لکھا:

"His utterances are not hit by the mischief of any section of PPC and threfore do not constitute any offence."

بیالیس سال کی نوکری میں مجھے ایک بھی ایسا واقعہ یاد نہیں جب میں مذہبی معاملات میں جذبات سے مغلوب ہوا ہوں - انتظامی طریق ہر قسم کے جذبات سے عاری ہوتا ہے۔ ویسے تو انسان خطا کا پتلا ہے کسی وقت بھی ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ سیاسی میدان میں جو Indiscretions ہوئیں ان کا میں نے برملا ذکر کر دیا ہے۔ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا اور اسلامی اقدار کو اپنانے سے ہی قائم رہ سکتا ہے۔ فرقہ واریت ایک ایسی آکاس بیل ہے جو سارے معاشرے کو اپنے زرد شکنجوں میں جکڑ سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا زہر ہے جو ایک دفعہ رگ و پے میں سرائیت کر جائے تو پھر کوئی تریاق اس کو ختم نہیں کر سکتا۔

[جاری ہے۔]

غزل

کب یہ دیوارِ بے رُخی نہ رہے
کیا خبر کب وہ اجنبی نہ رہے

کیا خبر کب وہ حال پوچھ ہی لے
بات کوئی بھی اَن کہی نہ رہے

کیا خبر کب وہ ہم قدم ٹھہرے
یہ اُداسی گلی گلی نہ رہے

انگلیاں ہم پہ ساتھ ساتھ اُٹھیں
شکوۂ بے توجہی نہ رہے

شہر کا شہر آشنا ٹھہرے
اجنبی ایک بھی گلی نہ رہے

بار بار ایک نام دُوہرائے
عشق میں سوچ بھی نئی نہ رہے

پاس آئے نہ آئے وہ لیکن
ہم سے وہ دُور دُور بھی نہ رہے

اتنا گر کر ہم اُن تک آئے ہیں
آدمی جیسے آدمی نہ رہے

کاش اب وہ ہمیں بھی پتھرا دے
دکھ نہ دکھ دے خوشی خوشی نہ رہے

کبھی لفظوں میں ڈھل نہ پائے حیا
کبھی جذبوں میں تازگی نہ رہے

اس سے پہلے کہ شہر بجھ جائیں
کاش آنکھوں میں روشنی نہ رہے

کاش یہ لفظ اشک بن جائیں
کاش یہ درد شاعری نہ رہے

ساتھ رہتے ہوئے بھی اے خالد
آپ کے ساتھ ہم کبھی نہ رہے

خالد احمد

غزل

مجھے سندر لکھائی مل گئی ہے
کتاب رونمائی مل گئی ہے

اکیلا پن مقدر میں ہے اس کے
مرے دل کو اکائی مل گئی ہے

تری اخلاص مندی کے تصدق
غزل یہ میرے بھائی مل گئی ہے

اُدھر پربت اُٹھے ہیں موتیوں کے
اِدھر غربت کی رائی مل گئی ہے

گرے تھے آسماں سے لوگ لیکن
مجھے گرنے کو کھائی مل گئی ہے

رہیں آوارگاں آباد سارے
انھیں گھر تک رسائی مل گئی ہے

کدورت قید ہے اب اُس کے دل میں
محبت کو رہائی مل گئی ہے

مجھے زخموں کا سبزہ کیا ملا تھا
مرے اشکوں کو کائی مل گئی ہے

زمانے کو ملے انعام ثاقبؔ
ہمیں بس پارسائی مل گئی ہے

آصف ثاقب

غزل

ہمارا حق اگر انصاف سے دیا جائے
پَری رُخ ایک ہمیں قاف سے دیا جائے

کیا ہے خون پسینے سے ہم نے جو پیدا
وہ مال چھین کے اشراف سے دیا جائے

ارادہ عرش ہلانے کا ہے لہٰذا زور
سبھی جوانب و اکناف سے دیا جائے

زبان ہی سے نہیں ، اپنی صلح جوئی کا
ثبوت سینۂ شفاف سے دیا جائے

جو نور ہم میں سرایت کیے ہوئے تھا کبھی
ہمیں وہ مانگ کے اسلاف سے دیا جائے

حوالہ اپنے بزرگوں کا احترام کے ساتھ
فقط فضائل و اوصاف سے دیا جائے

شعور بھیڑ میں تم نے زبان کی ہے دراز
جواب کیوں نہ سب اطراف سے دیا جائے

انور شعور

غزل

یہ جو بے وجہ شب روز چبھن سی کچھ ہے
اِس کے اظہار کی اک شکل سخن سی کچھ ہے

آ کے دنیا میں بھی آرام نہیں مل پایا
اور پہلے کے سفر کی بھی تھکن سی کچھ ہے

ابتری بھوگتا رہتا ہوں مگر لگتا ہے
ایک تالیف کہیں پر مرے من سی کچھ ہے

کوئی تصویر نگاہوں میں نہیں بن پاتی
دل کے اطراف مگر چھَن چھَنا چھَن سی کچھ ہے

سرِ احساس گھنی یاس کے ہوتے ہوئے بھی
دھڑکنوں ساتھ مسلسل تنانن سی کچھ ہے

ہم اُسی فطرتِ جاری کی رِجا جیتے ہیں
موسموں بیچ جو بگڑن میں بنن سی کچھ ہے

جانے ہو جائے ہے مفرور کہاں اُس کے حضور
جو یہاں کشمکشِ روح و بدن سی کچھ ہے

ایک ہی عکسِ جمالی کا ہے پرتَو عالی
یہ جو اک سوچ اور اک صورتِ فن سی کچھ ہے

جلیل عالی

غزل

کسی نے مجھ سے کہا ہے، بہت اُداسی ہے
نظر میں ایک خلا ہے بہت اُداسی ہے

ہوا بھی ٹھہری ہوئی ہے، فضا بھی ہے خاموش
کہیں پہ کچھ تو ہوا ہے بہت اداسی ہے

سفید برف کی مانند کورے کاغذ پر
مرے قلم نے لکھا ہے بہت اداسی ہے

میں کب سے گوش برآواز ہوں پکار و بھی
تمھیں تو اس کا پتہ ہے، بہت اداسی ہے

یہ لمحہ رُک سا گیا ہے کہ دیکھیے کیا ہو
کہیں سے اس نے سنا ہے بہت اداسی ہے

تمھاری جنبشِ لب سے سکوت ٹوٹے گا
سکوت چھایا ہوا ہے بہت اداسی ہے

کوئی رفیق کوئی آشنا نہیں بولا
یہ دھڑکنوں کی صدا ہے بہت اداسی ہے

مرے دریچے پہ شاید ہوا نے دستک دی
اُسے بھی میں نے کہا ہے بہت اداسی ہے

ترے لبوں کی حسیں پتیوں میں جنبش ہو
یہی تو ردِ بلا ہے بہت اداسی ہے

وہ راستہ بھی جو تیری گلی کو جاتا ہے
بہت اداس پڑا ہے بہت اداسی ہے

گلی کے موڑ پہ سُوکھا ہوا شجر تنہا
خراب و خستہ کھڑا ہے بہت اداسی ہے

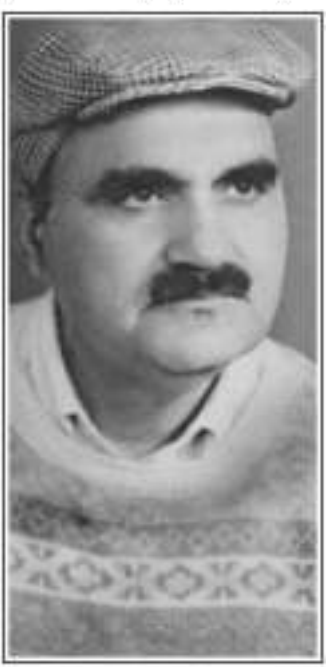

جمیل یوسف

غزل

موڑ کر وقت کا دھارا میں پلٹ آؤں گا
تم نے جس روز پکارا میں پلٹ آؤں گا

لوٹ آئے کوئی بھٹکا ہوا پنچھی جیسے
جب کیا تم نے اشارا میں پلٹ آؤں گا

تم نے جس شام کو بھولے سے مجھے یاد کیا
شام کا بن کے ستارا میں پلٹ آؤں گا

نشرِ پیغام ہوا دوشِ ہوا پر جس دن
نام سُنتے ہی تمھارا میں پلٹ آؤں گا

سرِ بازارِ محبت جو اُٹھایا ہم نے
بانٹ لینے وہ خسارا میں پلٹ آؤں گا

دشتِ غربت میں اگر بامِ فلک پر چمکا
میری قسمت کا ستارا میں پلٹ آؤں گا

عمر بھر کس نے کہا ہے مرا رستہ دیکھو
تم نے اک سال گزارا میں پلٹ آؤں گا

رُت بدلنے کا جب اعجاز اشارا پاکر
اُس نے زلفوں کو سنوارا میں پلٹ آؤں گا

عزیز اعجاز

غزل

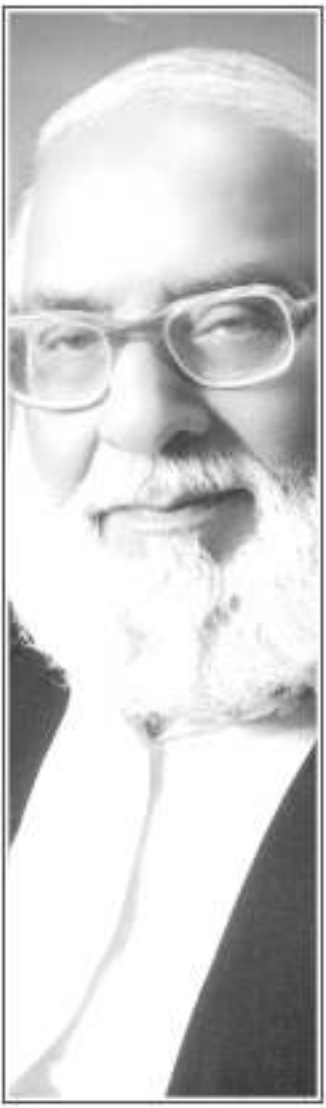

ہے یہ لازم کہ ہوں دوائیں بھی
کام آئیں مگر دعائیں بھی

ہوتا رہتا ہے سانحہ نت روز
اُجڑی رہتی ہیں اَب فضائیں بھی

راہی آنکھیں نہ بند کر بیٹھیں
راستے میں ہیں کچھ بلائیں بھی

ہم سا دریوزہ گر کہاں ہو گا
کون چاہے گا یُوں عطائیں بھی

بے طرح کیوں کِسی کو ہونے دیں
طرح داری اُسے سکھائیں بھی

مہک اُٹھے گی وادیٔ دل میں
نخلِ خوشبو اگر لگائیں بھی

آنکھ والے بھی حق کو پہچانیں
کور چشموں کو وہ جگائیں بھی

بھیروں کا ریاض کرکے ریاضؔ
من کے مندر سے لو لگائیں بھی

سید ریاض حسین زیدی

غزل

عشق میں جتنا مرا نقصان ہونا تھا، ہوا
مجھ کو آخر بے سر و سامان ہونا تھا، ہوا

میں یہاں رہتا بھی تو مقسوم اِس کا تھا یہی
یہ نگر برباد اور ویران ہونا تھا، ہوا

شاہ کی باغی رعایا کیوں معافی مانگتی؟
شہر برہم اور نافرمان ہونا تھا ہوا

عکس میں شامل ہوا لمسِ جمالِ یار بھی
آئنے کو اَور کچھ حیران ہونا تھا، ہوا

دیر تک دُنیا سرائے میں ٹھہرتا کون ہے
مجھ کو بھی کچھ دن یہاں مہمان ہونا تھا ہوا

ڈال دیں ہتھیار ہم، ایسا کبھی سوچا نہ تھا
شاہ کی جانب سے جو اعلان ہونا تھا ہوا

جشن برپا اِجتماعی موت کا ہے شہر میں
بس مجھی کو اس پہ نوحہ خوان ہونا تھا، ہوا

میرے افسانے کی سُرخی ہی تو اِس کی جان تھی
آخرش تو اس کو بے عنوان ہونا تھا، ہوا!

جب سبھی اہلِ ادب اہلِ سیاست ہو گئے
ہوشمندی کا یہاں فقدان ہونا تھا ہوا

دل میں کتنی روشنی تھی اس جھروکے کے سبب
بند لیکن یہ بھی روشن دان ہوا تھا، ہوا

جان دے کر بھی خسارے میں نہیں ہوں مَیں نسیم
مرحلہ یوں ہجر کا آسان ہونا تھا، ہوا

اب مرے دِل میں نہیں اُس کی حسیں یادیں نسیم
پھُول سے محروم یہ گلدان ہونا تھا، ہوا!

نسیمِ سحر

غزل

یہ سرزمین زیر و زبر ہو نہیں رہی
ہونی تو ہو چکی ہے مگر ہو نہیں رہی

مانوس ہو چکی ہے اندھیروں سے روشنی
سورج نکل رہا ہے سحر ہو نہیں رہی

آنکھیں بھری ہوئی ہیں مری ضبطِ اشک سے
برسات ہو رہی ہے مگر ہو نہیں رہی

پتھریلی وادیوں میں چلا جا رہا ہوں میں
ہمراہ میرے گردِ سفر ہو نہیں رہی

انجان بن رہا ہے وہ سب جانتے ہوئے
سب کو خبر ہے اس کو خبر ہو نہیں رہی

ذوقِ نمو بھی حبسِ مسلسل میں کھو گیا
سرسبز کوئی شاخِ شجر ہو نہیں رہی

میرے لیے ہی اس کی نظر بے قرار تھی
میری طرف ہی اس کی نظر ہو نہیں رہی

جو موج بھی کنارے پہ آتی ہے ختم ہے
اک موج بھی پلٹ کے بھنور ہو نہیں رہی

آمادہء زوال ہے یہ شہر اس لئے
اس شہر میں بھی قدرِ ہنر ہو نہیں رہی

وہ زندگی دے جس میں پریشانیاں نہ ہوں
یا رب یہ زندگی تو بسر ہو نہیں رہی

باقی عجیب درد کا عالم ہے ان دنوں
دل رو رہا ہے آنکھ بھی تر ہو نہیں رہی

باقی احمد پوری

غزل

کثرت سے خدوخال کے گرویدہ ملیں گے
کم کم ہی تجھے عشق میں سنجیدہ ملیں گے

صحرا میں کھلے، داد مہکنے پہ نہ پائی
کچھ پھول تجھے ایسے بھی نادیدہ ملیں گے

دیکھو گے نہ اوروں کی روش پر کبھی ہم کو
ہم اپنے ہی رستے پہ خرامیدہ ملیں گے

محفوظ یہاں کوئی حوادث سے نہیں ہے
ہر سینے میں گھاؤ کئی پوشیدہ ملیں گے

ملتا نہیں منزل کا نشاں دشتِ طلب میں
کیا علم تھا یوں راستے پیچیدہ ملیں گے

ممکن ہے کہ ہو سامنا کشتی کو بھنور کا
لازم نہیں آثار پسندیدہ ملیں گے

گلزار کہاں وقت کے آزر سے مفر ہے
ہر موڑ پہ اصنام تراشیدہ ملیں گے

گلزار بخاری

غزل

یہ اور بات غنیمت سرشتِ سر ہے بہت
قدم قدم پہ تماشاے رہ گزر ہے بہت

مجھے یقیں ہے کہ ہم دو کی زندگی کی لیے
ترا خیال بہت ہے، مرا ہنر ہے بہت

دہلنے لگتا ہے یہ دل ذرا سی آہٹ سے
اُجاڑنے کے لیے خود کو اک نظر ہے بہت

فساد سارے کا سارا یہ بال و پر کا سہی
ابھی فضاؤں میں پرواز کا سفر ہے بہت

پسِ نگاہ اُترنے کا چارہ کرتی نہیں
کہ اس معاملے میں آنکھ بے ہنر ہے بہت

یہ کیا کہ دل اُسی اک عکس کی تلاش میں ہے
نہایت آئنوں کی اس سے پیش تر ہے بہت

تم اس لیے نہیں آمادۂ سفر خالدؔ
کہ درد حد سے زیادہ ہے، آنکھ تر ہے بہت؟

خالد علیم

غزلیں

سوئے منزل رواں پے بہ پے زندگی
لوحِ محفوظ کا عکس ہے زندگی

کب سے پھرتی ہے ہاتھوں میں کاسہ لیے
ورنہ تھی کتنی انمول شے زندگی

تارے گنتی ہوئی ٹکٹکی باندھ کر
چشمِ حیراں کی مانند ہے زندگی

میں نے ناصر سے پوچھا تو اس نے کہا
میری نظروں میں ہے برگ نے زندگی

ایک یہ بھی سہی ذائقہ موت کا
خوف کس بات کا تجھ کو اے زندگی

جامِ کوثر پہ تھا ایسا پختہ یقیں
ہونے پائی نہ مرہونِ مے زندگی

ٹوٹے پھوٹے یا ہموار ہوں راستے
کرتی رہتی ہے پرواز طے زندگی

یعقوب پرواز

یوں گزرتی ہے اب زندگی دیس میں
جیسے گم صم کوئی اجنبی دیس میں

سر پٹختی پھرے اپنی بے چارگی
کتنی بے کار ہے آگہی دیس میں

خوب پھیلے گا اب تیرگی کا مرض
حد سے بڑھنے لگی روشنی دیس میں

ایک پل کا ٹھہرنا بھی مشکل ہوا
یوں مقدر ہوئی بے گھری دیس میں

ہوتے جاتے ہیں اسباب ہجرت بہم
بڑھتی جاتی ہے بے گانگی دیس میں

بیش قیمت ہو تم، بیش قیمت ہیں ہم
اب بھلا کون سی ہے کمی دیس میں

ہنستے دیکھا گیا آج پرواز کو
کچھ تو ہونے لگی بہتری دیس میں

غزل

بگڑے ہوئے ہیں آج کل اُنکے مزاج بھی
مجھ کو ملے ضرور مگر بات بھی نہ کی

اُن کے ہمارے درمیاں کُچھ مسئلہ نہ تھا
لیکن ضرور کوئی غلط فہمی ہو گی

سب کا معاملہ یہاں بس ایک ہی رہا
وحشت کے دائرے سے نہ نکلا یہاں کوئی

امکان ہے کہ آئیں گے وعدے پہ وہ ضرور
مجھ کو بتا رہی ہے مرے دل کی روشنی

کب سے کھڑے ہوئے ہیں ترے راستے میں ہم
کب ختم ہو گی جانے گھڑی انتظار کی

گو اِک زمانہ ہو گیا تُجھ سے جُدا ہوئے
محسوس ہو رہی ہے ابھی تک تری کمی

دروازہ کب کُھلے گا مرے انتظار کا
بس اتنی بات مُجھ کو بتا دے اے زندگی

ہوتی ہے اُن سے روز ملاقات دوستو
اُن پر گذر رہی ہے جو بتلائیں تو سہی

تاثیر اُس کے حافظے میں ہے ابھی تلک
میرا مزاج، میری طبیعت، مری خوشی

تاثیر نقوی

غزلیں

ہم سے مِل کر جو یہ اَب تجھ پہ نکھار آیا ہے
بقیہ دن رات کہاں یار گزار آیا ہے

مجھے لگتا ہے کسی کا تو سہارا ہو گا
ایک تنکا جو یہ بہتا ہُوا پار آیا ہے

یُوں کھڑا ہے مجھے لینے کو سفینہ جیسے
اُس طرف سارے زمانے کو اُتار آیا ہے

قفسِ زیست میں بیٹھے رہیں یا اُڑ جائیں
چمنِ یار سے پیغامِ بہار آیا ہے

خاور اعجاز

ہزاروں حادثے اِس طرح ٹل جاتے تھے پہلے
زمینوں کی کشش سے ہم نکل جاتے تھے پہلے

زیادہ دیر تک رہتے نہیں تھے گھپ اندھیرے
ذرا سی دیر میں ہی دیپ جل جاتے تھے پہلے

ابھی دو وقت کی روٹی نہیں ہوتی ہے پُوری
اِسی سرمائے میں بچّے بھی پل جاتے تھے پہلے

لیے پھرتا ہُوں اَب مہر و وفا کو چہ بہ کوچہ
یہی سکّے مِری بستی میں چل جاتے تھے پہلے

اَب فدائی ترا کس چیز پہ شرطیں باندھے
عمر کی پونجی تو دُنیا ہی میں ہار آیا ہے

ہم ہی موجود نہیں ہیں تو بلا سے اپنی
بھُول آیا ہے کہ اُس شاخ پہ خار آیا ہے

حد ہی کر دی ہے محبت میں بھی تُو نے خاورؔ
جان دے کر ہی ترے دل کو قرار آیا ہے

نئے موسم نے لفظوں کو بدل ڈالا ہے ورنہ
جہاں ڈھالیں اُسی سانچے میں ڈھل جاتے تھے پہلے

خُدا معلوم کیوں مضمونِ وصل اَب اُن کو بھایا
وہ اِس موضوع پر پہلو بدل جاتے تھے پہلے

غزل

ظلمتوں سے سمجھوتے کب تلک کرے کوئی
اس طرح کے جینے سے کیوں نہ اب مرے کوئی

روز چارہ گر کوئی ڈھونڈتا ہوں میں پھر سے
روز بانٹ جاتا ہے زخم پھر ہرے کوئی

قربتوں کے موسم کے زخم اور ہوتے ہیں
درد اور سہتا ہے آنکھ سے پرے کوئی

کھو گئے کہاں جانے لوگ جگنوؤں جیسے
بے چراغ راہوں میں روشنی کرے کوئی

کتنے موسموں سے ہی شاخ شاخ ویراں ہے
اجڑی شاخساروں کی جھولیاں بھرے کوئی

اب جلیل سوچا ہے جو بھی ہوگا دیکھیں گے
روز روز مرنے سے کب تلک ڈرے کوئی

احمد جلیل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

میں کیا حروف کے گلدان میں سجاؤں اُسے
کہ اک لطیف سے جذبے کا عکس پاؤں اُسے

غزل

اب بھی آنکھیں چار کر سکتا ہوں میں
یعنی اب بھی پیار کر سکتا ہوں میں

شرط بس اک ہے کہانی ہو تری
کوئی بھی کردار کر سکتا ہوں میں

اٹھ رہے ہیں ذہن میں تیکھے سوال
آپ کو لاچار کر سکتا ہوں میں

کچھ نہ کچھ دانست ہے تقویم کی
کل کا بھی دیدار کر سکتا ہوں میں

امن کا داعی ہوں ورنہ یہ نگر
کابل و قندھار کر سکتا ہوں میں

دوستوں کو عیب جوئی سے فقط
لمحے میں اغیار کر سکتا ہوں میں

منظور ثاقب

غزل

ذرا سی بات پہ' دل سے نکال دے گا مجھے
خبر نہیں تھی، زمیں پر اچھال دے گا مجھے

سنے گا بات بڑے انہماک سے میری
پھر اس کے بعد مہارت سے ٹال دے گا مجھے

اسی یقیں کے سہارے میں آج زندہ ہوں
مجھے یقیں تھا وہ رزقِ حلال دے گا مجھے

میں منتظر ہوں اسی چاند کا مثالِ شب
جو آ کے سوچ میں میری' اجال دے گا مجھے

مجھے یقیں ہے' زمانے کا منصف اعلیٰ
اسے جمال' تو ذوقِ جمال دے گا مجھے

مرا خدا، مرا مشکل کشا ہے، مشکل میں
کبھی میں گھر بھی گیا تو نکال دے گا مجھے

رہے گا اس طرح کچھ دن وہ میرے ساتھ اکرم
کہ ساتھ رہنے کی عادت سی ڈال دے گا مجھے

اکرم ناصر

غزل

ہم نے ترتیب سے سجائے ہیں
سارے مصرعے بنے بنائے ہیں

بیچنا تھا سو خود کو بیچ دیا
گھر کھلونے خرید لائے ہیں

ہم کو تعبیر سے نہیں مطلب
ہم نے تو خواب ہی سجائے ہیں

ضبط ٹوٹا تو یہ کھلا ہم پر
درد دل نے بہت چھپائے ہیں

وہ جو کہتا تھا ہم وہی کرتے
عمر بھر ناز ہی اُٹھائے ہیں

ہو گیا تلخ جب زمانہ تو
زیرِ لب ہم بھی مسکرائے ہیں

کارِ فرصت میں یہ خیال آیا
کارِ دنیا میں غم کمائے ہیں

آغا نثار

غزل

پھول کے بدلے یہاں پر خار کی امید رکھ
ظالموں کے شہر میں تکرار کی امید رکھ

سر جھکانے سے میاں عزت نہیں ملتی یہاں
سر رہے اونچا تو پھر دستار کی امید رکھ

صرف چلنا ہی نہیں کچھ حوصلہ بھی چاہیے
راہ میں ہر دن نئی دیوار کی امید رکھ

جس پہ کر احسان اُس کے شر سے بھی ڈر ہم نشین
دوست جب دشمن بنے تو دار کی امید رکھ

کوئی تو آئے گا لشکر سے بچانے کے لیے
دشمنوں کی صف میں اک سالار کی امید رکھ

بانجھ مٹی سے گریزاں کس لئے اقبال ہے
اب کہانی میں نئے کردار کی امید رکھ

اقبال سروبہ

غزل

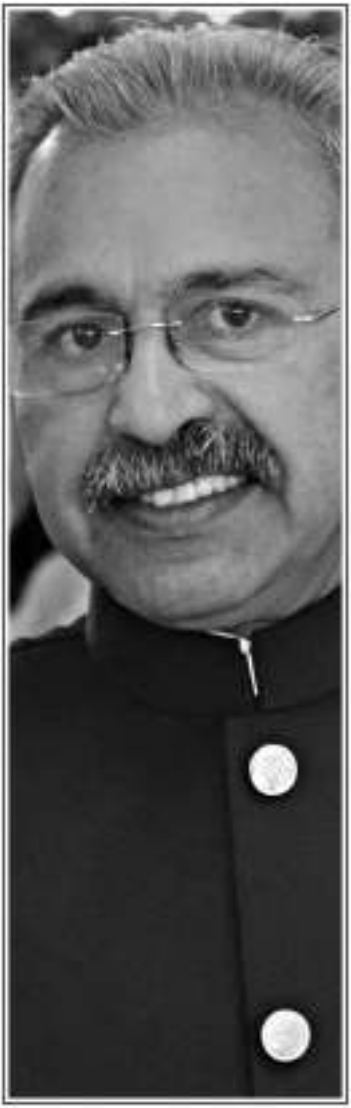

وہ مشورہ تو کر کے دیکھ لیتے مجھ ملنگ سے
بنا رہے ہیں جو یہاں مکان خشت و سنگ سے

شبِ وصال میں ملا مجھے وہ ایسے رنگ سے
کہ آج تک خمار ٹوٹتا ہے انگ انگ سے

جواب میں لبوں کے نقش دیکھنے کی آس میں
میں روز ان کو بھیجتا تھا پھول کس امنگ سے

زیادہ دیر تک چھپی نہیں کبھی ملاوٹیں
زمانہ جانتا ہے آدمی کو رنگ ڈھنگ سے

خلل نہیں دماغ کا انہیں تو اور کیا ہے پھر
جو امن استوار کرنا چاہتے ہیں جنگ سے

زمین تھرتھرا رہی تھی فکر میں تھا آسماں
مرے خیال کی ہوا میں ڈولتی پتنگ سے

سنے گا کون سرحدی ترے دکھوں کی داستاں
فراغ کس کو ہے یہاں زن و شراب و چنگ سے

راحت سرحدی

غزلیں

خدا کے حصے کے ہم سے سوال ہو رہے ہیں
ہمارے ساتھ بھی کیا کیا کمال ہو رہے ہیں

کھرچ دیا ہے شریک حیات نے دل سے
تجھے بھلائے ہوئے بیس سال ہو رہے ہیں

ترا سراپا پرویا تھا ہم نے پھولوں میں
لے تیرے تذکرے اب ڈال ڈال ہو رہے ہیں

افق پہ لگتا ہے سورج ابھرنے والا ہے
جو کج کلاہ تھے ان کے زوال ہو رہے ہیں

ہمارے وقت کو برباد کرنے والے پر
برا ہے وقت، برے اس کے حال ہو رہے ہیں

اوصاف شیخ

کبھی بھی مجھ سے وہ ہارا نہیں ہے
وہ میرا ہے مگر سارا نہیں ہے

کہا میں نے مرے جیسا بنا دو
کہا اس نے نہیں گارا نہیں ہے

ہوا جو ہو گیا آواز مت دو
ہوا جو اس کا کفارہ نہیں ہے

وہ شرق و غرب کا راہی ہے سیدھے رستے کا
ہمارے رستے جنوب و شمال ہو رہے ہیں

ہمارے سچ کی نشانی چمکتی پیشانی
غروب ہوتے ہوئے بھی مثال ہو رہے ہیں

کوئی دنوں میں وہ ہر ریت توڑ ڈالے گا
ہمارے رابطے اس سے بحال ہو رہے ہیں

بسا رکھا ہے تیرا ہجر دل میں
ابھی دیوار پر مارا نہیں ہے

تجھے میں اس لیے بھی چاہتا ہوں
بجز اس کے کوئی چارہ نہیں ہے

غزل

شتاب رسمِ تباہی ذرا نباہ ، گزر
کسے مجال کہ روکے تجھے اے راہ گزر

یہ بے خیالی کا رستہ ہے بانکپن کو سنبھال
گزر رہے ہیں سبھی تو بھی کج کلاہ ، گزر

ہیں عاشقی میں بھی محفوظ داخلے کے حقوق
یہ شاہرہ ہے مگر تو نے جانی شاہگزر

حذر کہ ہے تجھے ملحوظ شکوۂ شبِ تار
فضائے بے ادبِ آہِ صبحگاہ گزر

نہ کوئی زخم نہ لوہو نہ کوئی دردِ سحر
نہ جانے کب کے گئے میرے خیر خواہ گزر

حسنین سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یا خاک ہو جا خاک میں یا گھر بنا افلاک میں
اک دن تری دو رنگیاں ہم کو لہو رُلوائیں گی

غزل

کیسے دلِ بے تاب کا اظہار وہاں ہو
جس رشتۂ بے نام میں خاموشی زباں ہو

کس کو ترے پہلو میں غمِ سود و زیاں ہو
کیا کارِ محبت سے الگ کارِ جہاں ہو

ہر روز نئے خواب ہیں بہکانے کو اس کے
اے یادِ غمِ یار، سرِ دل نگراں ہو

صدقہ تری رعنائی پہ ہو گردِ مہ و سال
ہر روز ترا حسن نئی دھج سے جواں ہو

اب صرف تصور سے گزارا نہیں ممکن
تم ہو تو مرے پاس مگر دوست کہاں ہو

میں تیرے تکلم کا مزا تجھ کو چکھاؤں
اے کاش مرے منہ میں اگر تیری زباں ہو

الفاظ میں معنی نہیں پہرے ہیں زباں پر
اے دل کی خلش اب مری آنکھوں سے رواں ہو

دستار سے ملتی نہیں جاذب یہ فضیلت
سردار ہے وہ سر جو سرِ نوکِ سناں ہو

شکیل جاذب

غزل

تیری تصویر خواب میں رکھ دی
یعنی خوشبو گلاب میں رکھ دی

پہلے کچھ دن مرے لبوں پہ رہی
پھر اداسی کتاب میں رکھ دی

دنیا داری رکھی کنارے پر
اور محبت چناب میں رکھ دی

بھولی بھٹکی کوئی خوشی جو ملی
وہ بھی تیرے حساب میں رکھ دی

تیرے دل میں رکھی تھی ایک غزل
تو نے اپنے خطاب میں رکھ دی!

بجھتی جاتی تھی وہ گماں کی چمک
اس نے جھلمل سراب میں رکھ دی

فکرِ پیچ و خمِ زمانہ نے
شاعری پیچ و تاب میں رکھ دی

شہزاد نیّر

غزل

اس کے چہرے کی تابندگی چاہئے
ہے اندھیرا بہت، روشنی چاہئے

جان! تو اپنی مخمور آنکھیں دکھا
مجھ کو صہبا شکن مے کشی چاہئے

تیری چاہت نے بے حوصلہ کر دیا
مجھ کو پھر سے تری سرکشی چاہئے

آ، اے جانِ غزل! میرے نزدیک آ
کہ مجھے موسمِ شاعری چاہئے

مانتا ہوں بہت ہی خفا ہو مگر
اتنی تو بات سن لینی ہی چاہئے

ساری سوچوں نے بس اک نتیجہ دیا
ہم کو کر لینی پھر دوستی چاہئے

کیونکہ ہم بھی نہیں چاہتے موت کو
اور تم کو بھی تو زندگی چاہئے

ذکی طارق

غزلیں

آدمی کی کیا حقیقت؟ آدمی کچھ بھی نہیں
زندگی بے قدر شے ہے، زندگی کچھ بھی نہیں

چاند تاروں سے مزین آسماں بے سود ہے
دل اگر تاریک ہو تو چاندنی کچھ بھی نہیں

حسنِ عیار و ستم ایجاد کے نخرے، عبث
عشقِ سادہ کی اداسی، بے کلی کچھ بھی نہیں

جب عصائے موسوی حرکت میں آئے تو کمال
سامنے فرعون ہو یا سامری، کچھ بھی نہیں

گلشنِ دنیا کی رونق عارضی ہے عارضی
دائمی کچھ بھی نہیں ہے، سرمدی کچھ بھی نہیں

درحقیقت، نام ہیں دونوں ترے احساس کے
زخم ہائے آرزو ہوں یا خوشی کچھ بھی نہیں

تذکرہ شوکت نہ ہو جس میں جمالِ یار کا
وہ سخن کچھ بھی نہیں، وہ شاعری کچھ بھی نہیں

شوکت محمود شوکت

وفا، کامل رضا ہے اور کیا ہے؟
یقیں کی انتہا ہے اور کیا ہے؟

ہماری کامیابی کے سفر میں
کسی کی بس دعا ہے اور کیا ہے؟

مخالف، اس لیے بھی ہے زمانہ
کوئی اپنا بنا ہے اور کیا ہے؟

جہانِ بحر و بر سے آسماں تک
ہوا ہے یا خلا ہے اور کیا ہے؟

نگاہِ اہلِ دنیا میں زمانہ
بھلا ہے یا برا ہے اور کیا ہے؟

رقیبِ رو سیہ پر مہربانی
یہی تو اک گلہ ہے اور کیا ہے؟

زمیں مقتل کی صورت ہے جو شوکت
فقط، قحطِ وفا ہے اور کیا ہے؟

غزل

کسی اور کا ہے جہاں ، یار جی
ہے بیکار آہ و فغاں ، یار جی

پرانی کہانی کے کردار ہیں
نئی کب ہے یہ داستاں ، یار جی

کوئی بزم میں لوٹ آیا ہے پھر
عجب ہو گیا ہے سماں ، یار جی

گزارا ہے جب بے نشانی میں دن
تو کیا ڈھونڈنا ہے نشاں ، یار جی

اسلام عظمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک شجر کے کوئی دو پتے بھی اک جیسے نہ تھے
میری دنیا میں کسی شے کا کوئی ثانی نہیں

غزل

کیا بتاؤں تمہیں اپنے دن رات کی
کوئی حالت نہیں میرے حالات کی

ایک دفتر ہے میرے سوالات کا
ایک دنیا ہے میرے خیالات کی

اس کو دل میں بسانا مناسب نہیں
جس کو دیکھا نہ جس سے کبھی بات کی

دہر میں ایسی دھرتی کہیں بھی نہیں
جیسی دلدار دھرتی ہے گجرات کی

ہجر نے مار ڈالا ہے ، جانِ جہاں
کوئی صورت نکالو ملاقات کی

شہر میں جب پریشان ہوتا ہوں میں
یاد آتی ہے مجھ کو مضافات کی

لوگ لڑتے رہیں گے یونہی دوستو
جنگ جاری رہے گی مفادات کی

میں یہ اپنی زمیں، چھوڑ سکتا نہیں
سیر کرتا رہے وہ سماوات کی

انصر حسن

غزل

جو کچھ بھی اُٹھانا ہے قرینے سے اُٹھائیں
بس حسبِ ضرورت ہی خزینے سے اٹھائیں

کھل جائے گا رستا بھی گلابوں بھری چھت کا
پہلے خس و خاشاک تو زینے سے اُٹھائیں

پھولوں کو جو خواہش ہو مہکنے کی زیادہ
خوش بو کی لپٹ تیرے پسینے سے اُٹھائیں

ہاتھ آئے گی یوں کیسے زر و سیم کی زنبیل
پھنکارتا افعی تو دفینے سے اٹھائیں

یارانِ وفادار بہتر ہیں بہت ہیں
بہتر ہے نہ کچھ اور مدینے سے اٹھائیں

میں پار اُترنے کی ضمانت انھیں دوں گا
امیدِ شکستہ تو سفینے سے اٹھائیں

بھائے گی غمِ عشق کی تلخی کسے طالب
ہم ہاتھ جو اس زہر کو پینے سے اٹھائیں

طالب انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بند دروازہ تھا خالد ، یا عبادت گاہ تھی
اس کے در پر سارے بے کس، سارے بے گھر سو گئے

غزلیں

پیڑوں کی دیکھ بھال پرندوں کو سونپ دی
مردہ دلوں نے زندگی زندوں کو سونپ دی

دنیا و دیں تو فہم و فراست کے ساتھ تھے
یہ دل کی باگ ڈور تھی رندوں کو سونپ دی

جنگل کا انصرام ہے شہروں کی طرز پر
انسانیت یہ کس نے درندوں کو سونپ دی

پانی ملا رہے ہیں وہ اپنے ہی دودھ میں
یہ ذمہ داری ہم نے چرندوں کو سونپ دی

مسعود احمد

بچھڑنے والوں کا اتنا تو غم کیا جائے
کہ ان کا ذکر زمانے سے کم کیا جائے

ہوا کی بات اگر مان بھی لیں فرض محال
تو کیا چراغ اندھیرے میں ضم کیا جائے

وہ جن درختوں پہ اب گھونسلے نہیں بنتے
اب ان درختوں کی شاخوں پہ دم کیا جائے

ہمارے دشت میں دریا کا کوئی کام نہیں
لہو پسینے سے مٹی کو نم کیا جائے

سانسوں پہ بھی سوال اٹھیں گے حساب کے
گنتی اگر شمار کنندوں کو سونپ دی

مسعود اگلی نسلوں کے سودے کے ساتھ ساتھ
یہ زندگی بھی قرض دہندوں کو سونپ دی

امانتوں میں خیانت کا ارتکاب نہ ہو
مرے سپرد یہ رنج و الم کیا جائے

ہمارا جرم کہ ہم چوریاں پکڑتے ہیں
ہمارے ہاتھوں کو پہلے قلم کیا جائے

غزل

آہٹ سی ایک دل میں کہیں جاگتی رہی
خاموش ساری رات ہی ساری گلی رہی

لہروں سے اُس کے بال، شفق سا لباس تھا
ساحل پہ کتنی دیر قیامت کھڑی رہی

وہ تیرا انتظار تھا یا کرب ذات تھا
آنکھوں میں ساری عمر گلابی نمی رہی

ایسی خزاں کہ ہو گیا نابود گلستاں
شاخِ نہالِ غم جو ہری تھی ہری رہی

وہ کربلا کا دشت، وہ سجدہ، وہ تیز دھوپ
پھر نبضِ کائنات وہیں پر تھمی رہی

تاعمر اُس کی لو سے دمکتا رہا یہ دل
وہ یاد طاقچے میں ہمیشہ جلی رہی

ایسے جیے اور اتنا جیے تو کمال ہے
دل میں ہزار درد، لبوں پر ہنسی رہی

میں تو اُسے پکار کے خاموش ہو گیا
ساحل پہ اُس کے بعد ہوا چیختی رہی

فہیم شناس کاظمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ایک لمحہ تھا جسے آخرِ شب تک دیکھا
رات بھر منتظر اپنا ، درِ وا اپنا تھا

غزل

جب تجھے آنکھ میں تصویر کیا کرتا تھا
شوق جذبات کی تشہیر کیا کرتا تھا

اک تعلق تھا محبت کا تری یاد کے ساتھ
جو مرے پاؤں کو زنجیر کیا کرتا تھا

جب بھی آتا تھا مرا ذکر کبھی باتوں میں
اپنے ہر لفظ کو وہ تیر کیا کرتا تھا

لوگ پڑھتے تھے تو بے ساختہ رو پڑتے تھے
غم کو اپنے میں یوں تحریر کیا کرتا تھا

اک محل تھا جہاں شہزادی کوئی قید میں تھی
میں اسے خواب میں تسخیر کیا کرتا تھا

رنگ و رعنائی تخیل میں اتر آتے تھے
میں تجھے آنکھ میں تنویر کیا کرتا تھا

میں نے سیکھا تھا ہنر رات کو دن کرنے کا
آنکھ بھر خواب کی تعمیر کیا کرتا تھا

اٹھنے دیتا ہی نہ تھا دل ترے پہلو سے مجھے
لمحہ بھر شوق بھی تاخیر کیا کرتا تھا

حسنِ یوسف کے لیے سوت کی اٹی کی طرح
میں تجھے پانے کی تدبیر کیا کرتا تھا

اشرف کمال

غزل

تخیل میں جو صورت رہ گئی ہے
وہی مٹی کی مورت رہ گئی ہے

محبت کی وضاحت رہ گئی ہے
یہی تو اِک اذیت رہ گئی ہے

مجھے تم چھوڑ کر چلتے بنے ہو
کہو اب کیا قیامت رہ گئی ہے

ہماری بات تک سنتا نہیں تھا
ہماری بھی شکایت رہ گئی ہے

تری گفتار کے چرچے بہت تھے
تری ساری مہارت رہ گئی ہے

ہوئی کارِ محبت سے فراغت
فراغت ہی فراغت رہ گئی ہے

میں اپنے گاؤں کو پھر لوٹ جاؤں
یہ دل میں ایک حسرت رہ گئی ہے

طلعت شبیر

غزل

اس اذیت کو سرِعام بتا سکتا ہوں
کب ہوا شہر یہ نیلام بتا سکتا ہوں

کس نے اس دیس کی مٹی کی مہک بیچی ہے
کس نے خط میں دیا پیغام بتا سکتا ہوں

میں نے کردارِ محبت سے چُنے ہیں سارے
ہر کہانی کا میں انجام بتا سکتا ہوں

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے خلقت ساری
میں اُنھیں کوئی نیا کام بتا سکتا ہوں

کون میخانے سے لوٹ آیا ہے پیاسا رہ کر
کس کے ہاتھوں میں رہا جام بتا سکتا ہوں

چور دروازے سے مسند پہ جو آ بیٹھے ہیں
اُن لٹیروں کے تمھیں نام بتا سکتا ہوں

خوف ہی کوئی نہیں مجھ کو زباں بندی کا
ہر حقیقت میں سرِعام بتا سکتا ہوں

کون اس گھر میں عدو بن کے اُتر آیا ہے
کس نے بیچے ہیں در و بام بتا سکتا ہوں

جانتا ہوں میں سیاست کے اداکاروں کو
سازشی کھیل کا انجام بتا سکتا ہوں

تیری جرأت ہی نہیں مجھ کو خریدے آ کر
دشمنِ جاں میں ترے دام بتا سکتا ہوں

کس نے ہر آنکھ کو اشکوں سے نوازا ہے نوید
کب مچا شہر میں کہرام بتا سکتا ہوں

محمد نوید مرزا

غزل

رخشندہ نوید

اعتراف اور کتنی بار کریں
ہم ہیں روزے سے، اعتبار کریں

زخم کی ستر پوشی لازم ہے
اتنی روشن نہ رہگزار کریں

قہقہے پھیکے اشک ہیں نمکین
آپ جو چاہیں اختیار کریں

اتنی جلدی ہے کیا معافی کی
میرے مرنے کا انتظار کریں

کس نشانے پہ ہے ہدف ان کا
تیر کو دل کے آر پار کریں

وہ تو ہر اک کو جان کہتے ہیں
مجھ پہ وہ جان مت نثار کریں

مجھ میں کچھ کم ہوا ہے رخشندہ
میرے عضوِ بدن شمار کریں

غزلیں

رات گزری نہ آنکھ بھر سوئے
ہم کہاں تجھ کو بھول کر سوئے

دو جہانوں میں برسرِ پیکار
ایک پہلو سے بے خبر سوئے

ہم سگِ کوئے یار اپنے تئیں
غفلتی ہو کے در بدر سوئے

نوعِ انساں کی بے بسی دیکھو
نیند آتی نہ تھی مگر سوئے

چھوڑ خوابوں کے نرگیں بستر
جانے سب کیوں اِدھر اُدھر سوئے

باغ کے پہرے دار آئے کئی
اور اُن میں سے بیشتر سوئے

ہجر بیگار کا سمے کس کو
دن کے مصروف رات بھر سوئے

زندگی ، سب ترے تھکائے ہوئے
آخرش خاک اوڑھ کر سوئے

صائمہ آفتاب

سنبھل سنبھل کے وہ طے گام گام کر رہا ہے
سہج سہج کے تعلق پہ کام کر رہا ہے

دیے جلاتا ہوا ، گھنٹیاں بجاتا ہوا
بڑے ہی چاؤ سے اک بت کو رام کر رہا ہے

یہ آسمان ، یہ بے انتہا اداسی دیکھ
ستارہ وار یہاں غم خرام کر رہا ہے

یہ وقت باغ مہکنے کا ہے ، جگاؤ اسے
جو شخص خواب سرا میں قیام کر رہا ہے

سپردِ غیر نہ کر دوں میں اسکے دن جو اَب
کسی کے ساتھ بسر میری شام کر رہا ہے

محبتوں میں تو ہٹ دھرمیاں نہیں چلتیں
سو ایسا کر کے وہ قصہ تمام کر رہا ہے

غزل

بے وفائی کو لبادہ کر لیا ہے
اب جدائی کا ارادہ کر لیا ہے

تم فلک کو بانٹتے ہو، بانٹ لو پھر
ہم نے دل اپنا کشادہ کر لیا ہے

میں یہ باقی عمر تنہا کاٹ لوں گی
ہجر سے اب استفادہ کر لیا ہے

یعنی تجھ کو یاد بھی کرتی نہیں ہوں
یعنی تیرا غم زیادہ کر لیا ہے

ایک سادہ دل پہ دل جب آ گیا تو
تب ملیحہ خود کو سادہ کر لیا ہے

ملیحہ سیّد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ تو بتا اے آوارگی!
گھر جائیں گے کب لوٹ کر؟

غزل

کمال یہ ہے کہ کوئی کمال ہوتا نہیں
اور اس بساط پہ دل کو ملال ہوتا نہیں

مری زبان ہے اتنی گریز حسن طلب
ہر ایرے غیرے کے آگے سوال ہوتا نہیں

زمانہ ساز کچھ ایسے بھی میرے شہر میں ہیں
محال کام بھی جن پر محال ہوتا نہیں

حصارِ حسن میں، بندِ ادا میں آئے بغیر
کوئی خیال بھی حسنِ خیال ہوتا نہیں

اجڑ گئے ہیں کئی پیڑ میری بستی کے
بیان مجھ سے پرندوں کا حال ہوتا نہیں

محبتوں کے کلنڈر میں یہ خرابی ہے
کہ ختم ہجر کا کوئی بھی سال ہوتا نہیں

فراقِ یار ہے دراصل جائیدادِ جنوں
محبتوں کا اثاثہ وصال ہوتا نہیں

عزیز تجھ میں کوئی تو بڑی خرابی ہے
جو تیرا خود سے تعلق بحال ہوتا نہیں

عزیز فیصل

غزل

لے مَیں نے کر دیے خود ہی ترے حوالے پَر
اُڑان بھرنے سے پہلے ہی کاٹ ڈالے پَر

یقین تھا کہ کبھی صبح ہو بھی آئے گی
اندھیری رات میں ہم نے تبھی سنبھالے پَر

وہ سیر ہو کے کبھی خود بھی کھا نہیں سکتا
نظر جو رکھتا ہو ہر ایک کے نوالے پَر

ترے نصیب میں اونچی اُڑان ہے کہ نہیں
ہماری مان ، ذرا پہلے آزما لے پَر

مجھے تو اپنے ہی گھر میں کہیں اَماں نہ ملی
بھروسہ کیا میں کروں ''تیسرے طوالے'' پَر

دُعائیں کر چکے ، کوشش تمام کر بیٹھے
ہماری نظریں ہیں اب آسمان والے پَر

گزشتہ شب مرے آنگن میں چاندنی اُتری
گزشتہ شب ہی تری یاد نے نکالے پَر

شبہ طراز

غزل

قافلہ بے قطار تھا اپنا
اور میں سوگوار تھا اپنا

اب تو کچھ بھی نظر نہیں آتا
آنکھوں میں شمار تھا اپنا

گرد بیٹھی تو میں نظر آیا
جسم سارا غبار تھا اپنا

آنکھ تھی اور حسن تھا اس کا
دل کوئی آبشار تھا اپنا

اپنے اندر پلٹ کے آیا ہوں
دیر* سے انتظار تھا اپنا

*__ تصرف میر تقی میر

فیصل ہاشمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے ، نیکیاں رہ گئیں

غزل

اُمید اہلِ شہر کی بَر آئے کس طرح
شاخِ ریا پہ سچ کا ثمر آئے کس طرح

باہر تو منجمد ہیں اندھیرے قدم قدم
اندر سے روشنی کی خبر آئے کس طرح

سودا ہے جس کے سر میں ابھی آسمان کا
وہ میرے ساتھ خاک بسر آئے کس طرح

دل تو پگھل رہے ہیں تری اک نگاہ سے
پتھر میں تیرا درد اُتر آئے کس طرح

روشن بجھی ہے دھوپ تو اُس کی منڈیر پر
سائے مرے وجود میں در آئے کس طرح

اعجاز روشن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بات سے بات نکلنے کے وسیلے نہ رہے
لب رسیلے نہ رہے ، نین نشیلے نہ رہے

غزل

جس محبت نے تجھ کو تحرک دیا، وہ محبت مجھے مضمحل کر گئی
روشنی معتبر مجھ کو کرتی بھی کیا، زندگی تو سراپا ہی دل کر گئی

اس کی خاموشیوں نے وہ سب کہہ دیا، جس کو کہنے سمجھنے میں عمریں لگیں
اک جدائی تحیر میں ساکت رہی، یاد رخصت ہوئی تو نہ مل کر گئی

خواب رستوں پہ بیچوں کی سوداگری، بانجھ تھی اور پھر بانجھ ہی رہ گئی
بیج کے عنصر کی نشو نما رک گئی، اب کے جدت سبھی مبتدل کر گئی

چاند آنگن میں تھا، اس پہ کچھ داغ تھے، کس تیقن سے پھر بھی چمکتا رہا
روشنی پھیلتی اور سمٹتی رہی، خواب گہ کے دریچے بھی سل کر گئی

سعدیہ بشیر

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

یُوں ملاقاتیں ادھوری چھوڑ کر جاتے نہ تھے
تم تو میری دُکھ بھری باتوں سے اکتاتے نہ تھے

غزل

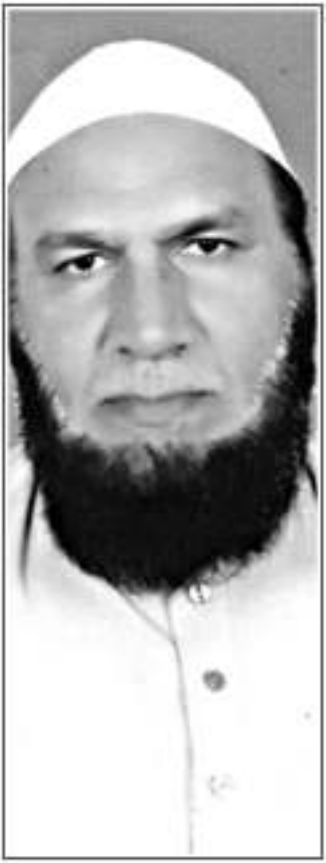

درد دیتا ہے تو پھر درد کا درماں بھی کرے
میرا محبوب مری جان پہ احساں بھی کرے

اب کے وہ آئے تو اس شان سے ملنے آئے
رازِ پنہاں کو مری بزم میں عریاں بھی کرے

اس کو دعویٰ ہے کہ ہے ایک برستا بادل
گونجتا اور گرجتا ہے تو باراں بھی کرے

ایسے وہ ہاتھ مرا تھام لے ہاتھوں میں کہ پھر
میری قسمت کے اندھیروں میں چراغاں بھی کرے

وہ رضا آئے تو مہکائے رہِ دورِ حیات
راستے کا ہکشاؤں سے فروزاں بھی کرے

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ نقش ایک محبت کے عکس تھے خالد
وہ رنگ اب تری تصویر سے نکال دیے

غزل

ایک طوفان آنے والا ہے
وقت الٹا گھمانے والا ہے

یہ جو صحرا دکھائی دیتا ہے
اک سمندر پرانے والا ہے

پھر سے بدلیں گے زاویے سارے
اتنا بھونچال آنے والا ہے

چھوڑ دو کشتیاں سمندر میں
پانی بستی میں جانے والا ہے

یہ جو پنچھی بکھر گئے سارے
آسماں کچھ گرانے والا ہے

مجھ کو معلوم ہے پسِ پردا
کون فتویٰ لگانے والا ہے

اتنا خاموش وہ نہیں رہتا
کچھ تو سازش رچانے والا ہے

جس کو آنکھوں کا نور سمجھا تھا
وہ مرا گھر جلانے والا ہے

عمران اعوان

غزل

کارِ دشوار لگ رہا ہے مجھے
ہجر آزار لگ رہا ہے مجھے

اِک اَداکار نے کہا مجھ کو
تُو اَدا کار لگ رہا ہے مجھے

کپکپاتے ہوئے یوں "ہاں" کہنا
تیرا اِنکار لگ رہا ہے مجھے

تُجھ سے چاہت پہ گفتگو کرنا
آج بے کار لگ رہا ہے مجھے

جس کے آنے پہ تو چَہک اٹھا
تیرا دِلدار لگ رہا ہے مجھے

کچھ پرندوں کے گھونسلے ہیں یہاں
پیڑ پھل دار لگ رہا ہے مجھے

ایک دیوار اٹھنے والی ہے
پَسِ دیوار ، لگ رہا ہے مجھے

پانی چُبھنے لگا ہے پیَروں میں
دَشت ہموار لگ رہا ہے مجھے

جَب سے خود کو اَلگ کیا تجھ سے
ذَرّہ کُہسار لگ رہا ہے مجھے

تیری دہلیز چومتا ہوا شخص
تیرا بیمار لگ رہا ہے مجھے

ڈوبتے وَقت دیکھ تو سورج
تیرا رُخسار لگ رہا ہے مجھے

تیرا ہنسنا برستی بارش میں
راگ مَلہار لگ رہا ہے مجھے

نَظم کہتا ہوا وہ شوخ حَسیں
مِثلِ گُلزار لگ رہا ہے مجھے

اُس کی آمد سے مَجلسِ غَم میں
پُرسہ تہوار لگ رہا ہے مجھے

عَقل و دانش کی بات کرتا، تُو !
کتنا عَیّار لگ رہا ہے مجھے

دانش عزیز

غزل

تمہارا چہرہ دکھا رہی ہیں ،اداس صبحیں ، اداس شامیں
مجھے کیوں اتنا ستا رہی ہیں، اداس صبحیں ، اداس شامیں

میں دل گرفتہ ہوں میرے کانوں میں آہٹیں کس کی گونجتی ہیں
غزل وفا کی سنا رہی ہیں، اداس صبحیں ، اداس شامیں

کسی کی پرچھائیں کھینچتی ہے مجھے محبت سے ان کی جانب
یہ دل کو پاگل بنا رہی ہیں، اداس صبحیں، اداس شامیں

ہے آگ سینے میں جیسے میرے، یہ جسم و جاں بھی دھواں دھواں ہیں
سلگ سلگ کے جلا رہی ہیں، اداس صبحیں، اداس شامیں

بلا سبب ہی، بغیر مقصد، اجاڑ رستوں پہ چلتے جانا
کہاں کہاں پہ گھما رہی ہیں، اداس صبحیں، اداس شامیں

تمہارے جانے کے بعد گھر کو کہیں بھی مل جائیں گے یقیناً
کہ ساتھ رہنے جو آ رہی ہیں، اداس صبحیں، اداس شامیں

نہ جانے کس کی صدائیں جبرانؔ دل کے تاروں کو چھیڑتی ہیں
سنو! کہ تم کو بلا رہی ہیں، اداس صبحیں ، اداس شامیں

وسیم جبران

غزل

میانِ رونقِ دنیا بہت ہوں
کہوں کس سے کہ میں تنہا بہت ہوں

بکھرنا چاہتا ہوں ساحلوں پر
میں دریا ہوں مگر گہرا بہت ہوں

نہیں آساں مجھے مصلوب کرنا
تری سولی سے میں اونچا بہت ہوں

پرندے بھی مجھے پہچانتے ہیں
میں ان پیڑوں تلے بیٹھا بہت ہوں

بہت دل کش ہیں سنگ و سر کے رشتے
تری گلیوں سے میں گزرا بہت ہوں

نجانے کیا خطا سرزد ہوئی تھی
میں اپنے آپ پر برسا بہت ہوں

توقیر عباس

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سبھی آنکھیں ہیں ہماری آنکھیں
گھل کے بہہ جائیں نہ ساری آنکھیں

غزل

آیا ہوں تجھے یاد کوئی بات تو ہے نا
جذبات کے ہاتھوں یہ تری مات تو ہے نا؟

اے شخص ترے دل سے نکلنے کا نہیں میں
جیسی بھی ہوئی ایک ملاقات تو ہے نا

تو شہر کے سارے ہی حسینوں سے الگ ہے
میرے لیے یہ باعثِ خدشات تو ہے نا

محفل میں مجھے دیکھ کے منہ پھیر لیا ہے
یہ صرف نظر بہرِ شکایات تو ہے نا

جو بات بتانے سے گریزاں ہو ابھی تک
اس بات کے اندر بھی کوئی بات تو ہے نا

اٹھی ہیں صغیر اس کی جو خاموش نگاہیں
وہ مائلِ الطاف و عنایات تو ہے نا

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لیے پھرتا تھا جو در در مجھ کو
بھول سکتا ہے وہ کیونکر مجھ کو

غزلیں

پھول کھلنے لگے اور رات سہانی آئی
تیرے آنے کی خبر جب مری رانی آئی

میرے اجداد نے میراث میں ہجرت چھوڑی
میرے حصے میں بھی بس نقل مکانی آئی

مدتوں بعد جو اسباب سنبھالا میں نے
یار کی اس میں نظر مجھ کو نشانی آئی

آج جب بزم میں اک دوست پرانا دیکھا
آج پھر یاد کوئی چوٹ پرانی آئی

جب عریضے کو کیا میں نے سپردِ دریا
ٹھہرے پانی میں نظر مجھ کو روانی آئی

بات کہنے کے ہنر پر تھا بہت ناز مجھے
پر کبھی اپنی کہانی نہ سنانی آئی

دل تڑپتا ہے لہو بہتا ہے آنکھوں سے مری
جب بھی یاد اسکی مجھے اشک فشانی آئی

سید فرخ رضا ترمذی

جب ہم نے بار بار اسے آزما لیا
تب ہی تو اس کے بارے کوئی فیصلہ لیا

شب بھر تمہاری یاد میں مخمور سا رہا
شب بھر تمہاری یاد کا ایسا مزا لیا

تاریکیوں میں روشنی پانے کے واسطے
ہم نے تمہاری یاد کو جگنو بنالیا

تجھ سے وصال میرے لئے ہے کمالِ ذات
ہم نے ترے جمال سے خود کو سجا لیا

یاروں کا حال دیکھ کے فرخ رضا نے اب
چپ چاپ اپنا حال سبھی سے چھپا لیا

غزل

یہ محبت کوئی بلا تو نہیں
مجھ کو یاروں کی بددعا تو نہیں

اتنا اجلا لباس پہنا ہے
وہ کہیں ہاتھ آگیا تو نہیں

ایک دن اس نے یہ کہا مجھ سے
رہگزر ہے یہ راستہ تو نہیں

حسنِ ترتیب سے گماں گزرا
آپ کا ان سے رابطہ تو نہیں

یوں تو دریا تھا اپنے جوبن پر
کشتی والوں سے جا ملا تو نہیں

جس دریچے کو بیل جا پہنچی
اس دریچے میں تُو کھڑا تو نہیں

آنکھ میں خون کیسے اترا ہے
تو کہیں خود سے لڑ پڑا تو نہیں

تُو مری اولیں محبت ہے
تُو مری آخری دعا تو نہیں

یونہی موسم کا حال پوچھا ہے
یہ مرا اصل مدعا تو نہیں

چارہ گر ہو کمال کے شاہد
آپ لیکن میرے خدا تو نہیں

افتخار شاہد

غزل

اپنا دکھ حیطۂ تحریر میں لے آتا ہوں
آسماں ، حلقۂ زنجیر میں لے آتا ہوں

پھیکے پڑ جائیں تصور میں اگر نقش ترے
وصل کے رنگ مَیں تصویر میں لے آتا ہوں

بے یقینی کو گزرنے نہیں دیتا حد سے
خواب کو وادیٔ کشمیر میں لے آتا ہوں

اپنے دریا کو مَیں کرتا ہوں سمندر کے سپرد
جتنے غم ہوں ، غمِ شبیر میں لے آتا ہوں

جانے لگتا ہے کبھی غالبؔ و اقبالؔ کے ساتھ
دل اُٹھا کر مَیں رہِ میرؔ میں لے آتا ہوں

خوش بیانی سے نئے پھول کھلاتا ہوں ظہورؔ
اپنے اشعار کو تاثیر میں لے آتا ہوں

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ ہم پہ جتائیں گے ، ہم صبح کے شیدائی
سورج کے تمنائی ، تارے بھی گنوا دیں گے

غزل

بے شک خلا میں دور کہیں ہو یہاں نہ ہو
ایسی زمیں ہو جس کا کوئی آسماں نہ ہو

میرے خدا تو ضبط میں ایسا کمال دے
یعنی کہ آگ تو جلے لیکن دھواں نہ ہو

میں چاہتی ہوں آپ سے ہو جب بھی سامنا
دل زخم زخم ہو مرا ، لب پر فغاں نہ ہو

کچھ راستے عجیب سی رکھتے ہیں اک خلش
منزل کا چاہے کوئی بھی نام و نشاں نہ ہو

آنکھیں ہیں مجھ پہ جس قدر اتنے سوال ہیں
پوچھے نہ کوئی مجھ سے کچھ اب امتحاں نہ ہو

میں آؤں بزم ناز سجانے کے واسطے
اور اس کے بعد کوئی یہاں سے وہاں نہ ہو

دیکھو تو سارا لطفِ سخن اس کے دم سے ہے
وہ بزم شعر کیا ہوئی رفعت جہاں نہ ہو

رفعت وحید

غزل

جو تشنہ زائچہ بناتا ہے
اور مقدر خدا بناتا ہے

جس کی منزل کہیں نہیں ہوتی
کون وہ راستہ بناتا ہے

ایک دریا نے مجھ کو بتلایا
عشق کچا گھڑا بناتا ہے

گھر کے آنگن میں گر شجر ہو تو
صاف آب و ہوا بناتا ہے

روز تجدیدِ قید ہوتی ہے
روز وہ حاشیہ بناتا ہے

تیرگی کو اجالنے کے لیے
کوئی دل کو دیا بناتا ہے

لوگ پتھر مزاج ہوتے ہیں
یار تو آئنہ بناتا ہے

ارشد محمود ارشد

غزل

چاہت کا رنگ روپ نکھارا نہ جا سکا
اُن کو نظر سے دل میں اُتارا نہ جا سکا

ملنے کی دیر تھی کہ بچھڑنا پڑا ہمیں
بارِ وفا کسی سے سہارا نہ جا سکا

کرنے کو یوں تو ہم نے بہت کچھ کیا مگر
بگڑا ہوا نصیب سنوارا نہ جا سکا

جاتے ہوئے خبر نہیں کیا تُو نے کر دیا
اِک پل ترے بغیر گزارا نہ جا سکا

تبلیغ ، وعظ ، پند ، نصیحت سے کیا حصول
خود کو ہی جب عمل پہ اُبھارا نہ جا سکا

مدت ہوئی کہ ہم سے جدا ہو چکے ہو تم
دل سے مگر خیال تمہارا نہ جا سکا

اُس انجمن میں کیسے پہنچتے بذاتِ خود
جس انجمن میں ذکر ہمارا نہ جا سکا

بچپن کی ایک ایک خطا مجھ کو یاد ہے
ماں کے سوا کسی کو پکارا نہ جا سکا

فیضان! میں تو حُسن کا دل جیتنے کو تھا
افسوس میرے عشق سے ہارا نہ جا سکا

فیض رسول فیضان

غزل

مفلسی کی نہیں تکلیف نہ بیماری کی
میرا دکھ یہ ہے کہ بچوں سے اداکاری کی

دکھ ستِ تیغ کیے ہجر کو بخشی دھڑکن
اپنی جاگیر میں ہم نے بڑی سرداری کی

آستینوں میں لیے بیٹھی ہیں شاخیں خنجر
کس نے دھرتی پہ ہے نفرت کی شجرکاری کی

سکھ کو پانے کے لئے پھرتا تھا مارا مارا
پھر بھی تجھ درد کی اس دل نے خریداری کی

خواب دیکھے بھی نہیں رنگ بھی آنکھوں سے گئے
دلِ معصوم نے یہ کیسی سمجھداری کی

نہ مرا وصل سلامت نہ رہا ہجر میں دم
دنیا والو کوئی حد ہوتی ہے لاچاری کی

خواب آنکھوں میں رکھے دیپ سرِ بام جلے
یوں شبِ ہجر بسر کرنے کی تیاری کی

درد سہنے سے ہی احساس توانا ہو گا
بات ہے حوصلے کی اور سمجھداری کی

پھول بھیجے ہیں اسی شخص کو پھر بھی فیصل
جس نے ہر لحہ مخالف کی طرفداری کی

فیصل زمان چشتی

غزل

رگڑ ہی چکے ایڑیاں جیسے جیسے
وہ کستے رہے بیڑیاں جیسے جیسے

بھرا رہتا ہے اس کا دامن بھی ہر دم
لٹاتا ہے وہ جھولیاں جیسے جیسے

زباں پر بنے سنورے آتے ہیں جملے
نکھرتا ہے ان کا بیاں جیسے جیسے

اترتے ہیں دل میں وہ الفاظ اس کے
میں سنتا ہوں اردو زباں جیسے جیسے

زیارت کو پھر دل ترستا ہے میرا
بیاں ہوں تری خوبیاں جیسے جیسے

کھٹکتے ہیں پھر بام و در رات ہوتے
جو ہوتی ہے سازش عیاں جیسے جیسے

زمانہ کھڑا تھا وہیں رو کے احمد
بنے اشک سیلِ رواں جیسے جیسے

علی رضا احمد

غزلیں

شجر نے چھاؤں سے اٹھنے کا جب کہا ہی نہیں
تھکے ہوؤں نے سفر کا تو سوچنا ہی نہیں

ندی میں پانی بھی کم تھا، بہاؤ بھی، لیکن
میں پست حوصلے والا! گزر سکا ہی نہیں

کوئی لگائے مری بے بسی کا اندازہ
ٹپکتی آنکھ ہے اور زیرِ لب دعا ہی نہیں

مجھے خبر ہے مرے دوست چھوڑ جائیں گے
دیا بجھا کے جلانے کا فائدہ ہی نہیں

علی آرش

تجھے میں کیسے بھلاؤں، یہ التماس نہ کر
مرے گلے سے لپٹ کر مجھے اداس نہ کر

انا پرست ہوں، لیکن پلٹ بھی سکتا ہوں
بھلا یہی ہے کہ تو مجھ کو رہ شناس نہ کر

ترے غلام حقیقت میں ہیں ہوس کے غلام
اے شاہ زادی! غلاموں کو اتنے پاس نہ کر

کسے کہوں، مری تنہائی کھا رہی ہے مجھے؟
کسے کہوں، کہ یہاں کوئی آشنا ہی نہیں

میں تیز گام ہوں، ورنہ مرے لیے آرش
گرے ہوؤں کو اٹھانا تو مسئلہ ہی نہیں

تجھے کہا تھا تعلق کو ٹوٹنے مت دے
تجھے کہا تھا کہ اس راستے پہ گھاس نہ کر

نصیب کوسنے والے! میں چیختا بھی رہا
یہ عشق کھیل نہیں ہے تُو اس میں ٹاس نہ کر

غزل

سارا نشہ اتر گیا ہو گا
کوئی خود پر ہی مر گیا ہو گا

لہو بارش میں ڈھل رہا ہے یہاں
وقت یلغار پر گیا ہو گا

کانچ بکھرا ہے سارے کمرے میں
آئنہ خود سے ڈر گیا ہو گا

دل گیا پہلے ، پھر گئی آنکھیں
اب محبت میں سر گیا ہو گا

سکۂ عشق اب چلے نہ چلے
کاسۂ دل تو بھر گیا ہو گا

خود سے لڑتے ہوئے میں غازی تھا
جنگ جیتا ہوں ، سر گیا ہو گا

خود سے ہی ہو گا سامنا تحسینؔ
وہ مقابل اگر گیا ہو گا

سید تحسین گیلانی

غزل

لوگوں سے جس نے خود کو چھپایا، وہ کون تھا
کل شب نقاب پوش جو آیا، وہ کون تھا

وہ کون تھا کہ جس نے الٹ دی بساطِ خواب
جس نے یہ سارا کھیل رچایا، وہ کون تھا

ہم سارے دوست ایک جگہ جمع ہوتے ہیں
دشمن کو جا کے جس نے بتایا، وہ کون تھا

افلاس کی لکیر سے نیچے ہو خیمہ زن
تم کو جو اس نشیب میں لایا، وہ کون تھا

حرمت سبھی پہ فرض ہے دل کے مکان کی
دیوار جو پھلانگ کے آیا، وہ کون تھا

آزاد سرزمین میں پیدا ہوئے تھے ہم
جس نے ہمیں غلام بنایا، وہ کون تھا

سارے ثبوت اس کے تعارف کے جل چکے
اب تک کسی پہ کُھل نہیں پایا، وہ کون تھا

آواز اُٹھانے والے اُٹھا ہی لیے گئے
جس نے بھی غائب ان کو کرایا، وہ کون تھا

جینے کا حق بھی چھین رہا تھا جو خلق سے
آخر کو کون تھا وہ، خدایا! وہ کون تھا

در پردہ سازشوں میں ملوّث بھی تھا ضرور
کُھل کر جو سامنے بھی نہ آیا، وہ کون تھا

خوابوں کے پیڑ اُگائے چلے جا رہے تھے ہم
جو کر رہا تھا اُن کا صفایا، وہ کون تھا

بچے تو پھول ہوتے ہیں اللہ کے باغ کے
پامال اُن کو جس نے کرایا، وہ کون تھا

میری متاعِ بے سر و سامانی لُوٹنے
چوروں کو جس نے ساتھ ملایا، وہ کون تھا

لیتا نہیں تھا نام کوئی خوف سے مگر
پہچانتی تھی اُس کو رعایا، وہ کون تھا

شاہد کو اور کچھ ہی سمجھتے رہے ہیں ہم
یہ تو اک اجنبی نے بتایا؛ وہ کون تھا

شاہد ماکلی

غزل

میں مر رہا تھا کسی نے نہیں بچایا مجھے
ستم تو یہ ہے کہ تو بھی نہ یاد آیا مجھے

وہ مجھ کو چھوڑ کے جائے گا اور میں خوش رہوں گا
اس ایک بات پہ اس شخص نے منایا مجھے

جناب اس کی میں کوزہ گری کا شاہد ہوں
بغیر چاک کے جس ذات نے بنایا مجھے

میں جس وقار سے جیتا تمھارے وصل سے جنگ
جناب ہجر نے کاندھے پہ تھپتھپایا مجھے

میں ایک نوحے سے نغمے میں ہو گیا تبدیل
تمھارے ہونٹوں نے جس دن سے گنگنایا مجھے

اظہر عباس خان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس نے مہرِ کرم چکایا
پگ پگ دھوپ کا ہُن برسایا

غزل

میں جس کے حُسن پہ مرتا ہوں وہ نہیں ملتا
غریب شخص ہوں ڈرتا ہوں وہ نہیں ملتا

یہ میری تیرہ نصیبی ہے شہرِ خوباں میں
کہ جس سے عشق بھی کرتا ہوں وہ نہیں ملتا

وہ آئنہ ہے اُسی خوش جمال کی خاطر
ہمیشہ میں بھی سنورتا ہوں وہ نہیں ملتا

سمندروں کی تہوں میں اُسی گہر کے لیے
نہ پوچھ روز اترتا ہوں وہ نہیں ملتا

گزر گیا ہے چمن سے بہار کا موسم
خزاں کی رت میں بکھرتا ہوں وہ نہیں ملتا

کہیں ملے تو یہ کہنا ''مجید امجد'' سے
میں روز اِدھر سے گزرتا ہوں وہ نہیں ملتا

اذیتوں کے سمندر کے درمیاں ہوں اسد
میں ڈوبتا ہوں ابھرتا ہوں وہ نہیں ملتا

اسد اعوان

غزل

اس کی نظر نے لوٹ کے رنجور کر دیا
مجھ کو ہی میری ذات سے کچھ دور کر دیا

ہائے ! کسی کی چاہ نے پرواز چھین لی
اک دائرے میں ہی مجھے محصور کر دیا

دیکھا ہے اس نے میری طرف اتنے پیار سے
پل بھر میں دل کو پیار سے معمور کر دیا

ہر چند تھی ستاروں سے آگے مری نظر
دنیا کی چاہتوں نے تو مغرور کر دیا

اچھا بھلا میں کام کا اک شخص تھا سجن !
خوابوں میں تیری دید نے معذور کر دیا

گمنام تھا شہاب مگر اب نہیں رہا
سارے جہاں میں عشق نے مشہور کر دیا

شہاب اللہ شہاب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھا نہ ہمیں تُو نے خط و خال سے آگے
اِک شہر تھا ، اِس شہرِ مہ و سال سے آگے

غزلیں

مات دو روایت کو
بخش دو محبت کو

چاہتا ہوں میں تیری
بے لگام چاہت کو

دیکھ بھال کر کاٹو
زندگی کی مہلت کو

پانیوں سے الجھن ہے
ایک چاند صورت کو

انتظارِ عادل ہے
کیا کسی محبت کو؟

عزیز عادل

سادہ آدمی ہے
یہ بڑی خوشی ہے

مضطرب ہوا کی
آنکھ شبنمی ہے

تن کی دھونکنی میں
سانس جل رہی ہے

دل میں نفرتوں کی
پھانس چبھ گئی ہے

کل یہاں پہ میں تھا
تو جہاں کھڑی ہے

عادل اس جگہ کیا
تُو نہیں چلی ہے؟

غزل

کچھ بھی نہیں جدھر وہاں جانا کچھ اور ہے
اور لاوجود سامنے لانا کچھ اور ہے

کم تو کسی طرف سے نہیں لگ رہا، مگر
کچھ جگہوں سے ابھی بھی بڑھانا کچھ اور ہے

کیوں چپ کسی دباؤ میں آ کر ہو جاؤں پھر
ایسے معاملے کو اٹھانا کچھ اور ہے

کچھ اور بھول جاتا ہوں معلوم ہے مجھے
یہ یاد ہی نہیں کہ بھلانا کچھ اور ہے

کچھ اور دیکھ کر تو کہیں بھی نہ دیکھ پاؤں
تم کہتے ہو ابھی بھی دکھانا کچھ اور ہے

ماحول سا بنا کے کسی اور طرح کا
اس مختلف کو میں نے بتانا کچھ اور ہے

بنتا ہوا کچھ اور نظر آتا ہے مگر
کوشش تو یہ رہی کہ بنانا کچھ اور ہے

بندِ قبا بھی ایسے کہ آتی نہیں سمجھ
اس نے دکھانا ہے کہ چھپانا کچھ اور ہے

گو سطح بھی ہے دولتِ بے پایاں گل فراز
پر سطح سے پرے کا خزانہ کچھ اور ہے

گل فراز

غزل

زمیں بدلتا ہوا آسماں بدلتا ہوا
میں خود بدل گیا کون و مکاں بدلتا ہوا

دُرونِ خیمۂ دِل ہے سماں بدلتا ہوا
کوئی ہو رات کو جیسے مکاں بدلتا ہوا

تری کنیز ، تری رازداں بدلتی ہوئی
مِرا امیر ، مِرا مہرباں بدلتا ہوا

تری گلی سے نکلنے کا استعارہ ہے
مرا ستارہ سرِ آسماں بدلتا ہوا

جنابِ پیرا جسے تونے آگہی بخشی
وہی مُرید ہے کیوں آستاں بدلتا ہوا

حَسین لڑکیاں کیسے بھلا سکوں گا میں
پہنچ تو جاؤں گا گھر گاڑیاں بدلتا ہوا

امتیاز انجم

غزل

بظاہر جو اکیلا ہے
وہ اپنے ساتھ بیٹھا ہے

مجھے خاموش رہنا ہے
کہانی کار کہتا ہے

کوئی رونے لگا مجھ میں
یہ کیسا خواب دیکھا ہے

نظر انداز کرنا بھی
سزا دینے کے جیسا ہے

مقابل بیٹھنا آ کر!!
مجھے تسلیم کرنا ہے

ترے بن چار سو صحرا
ترے بن آنکھ دریا ہے

تمھارے مسکرانے سے
ہمارا حال اچھا ہے

کہا اُس نے مجھے سن کر
یہ اچھے شعر کہتا ہے

سبھی کردار ہیں اکمل
یہ دنیا' اک تماشا ہے

اکمل حنیف

غزل

دل میں وہ درد اٹھا آخرِ شب
تو بھی درماں نہ ہوا آخرِ شب

وہ بھی خوشبو میں ڈھلا آخرِ شب
میں بھی پھر میں نہ رہا آخرِ شب

دل سرائے میں ہے تنہا روشن
تیری یادوں کا دیا آخرِ شب

تیری یادوں کو بھگو دیتی ہے
جب بھی برسی ہے گھٹا آخرِ شب

مجھ کو مجھ سے ہی ملانے کے لیے
کوئی دیتا ہے صدا آخرِ شب

دن کو بے چین کیے رکھتا ہے
درد بنتا ہے دوا آخرِ شب

اس سے پہلے کہ یہ منظر بدلے
ایک الفت کی نگہ آخرِ شب

تم کو معلوم نہیں بارش میں!
چاہ ہوتی ہے سوا آخرِ شب

ہر اک آہٹ پہ ترے دھوکے میں
ہر دریچے پہ گیا آخرِ شب

روبرو آ کے مرے بیٹھ گیا
اس کو یوں یاد کیا آخرِ شب

اپنا یہ گھر رہے یوں ہی قائم
اک طلب، ایک دعا آخرِ شب

اک دریچہ تو کھلا ہوتا حبیب
اب کہاں جائیں بتا آخر شب

بشیر احمد حبیب

غزل

جسے دیکھیے نگر میں ، وہی بولے تیری بولی
تُو کہاں کا پھر رہے گا؟ جو زبان ہم نے کھولی

یہ عنایتیں ہیں ساری ، یہ ہے عاشقی کا بدلہ
پڑی عمر بھر ہی کھانی ، ہمیں دردِ سر کی گولی

بڑے خوش نُما ہیں لیکن ، ترے رنگ سارے کچے
نہیں کام کے ہمارے ، تُو ہی کھیل اِن سے ہولی

بے دریغ اشک آئے ترے سامنے نہ روئے
کبھی آستیں سے پونچھے ، کبھی چُنری ہی بھگو لی

جہاں جا کے بیٹھتے تھے ، ترے خط نکال کر ہم
وہیں آ کے بیٹھ جاتی ، تری بدمعاش ٹولی

کریں کیوں نہ ہائے ہائے ، بڑے ہیں طمانچے کھائے
بڑے غم ہیں ہم نے جھیلے ، تھی خوشی میں آنکھ کھولی

ملے چار کاندھے جن کو ، اسی دور بے نوا میں
تھا نصیب اُن کا اچھا ، جو گئے ہیں چڑھ کے ڈولی

الماس شبی

غزل

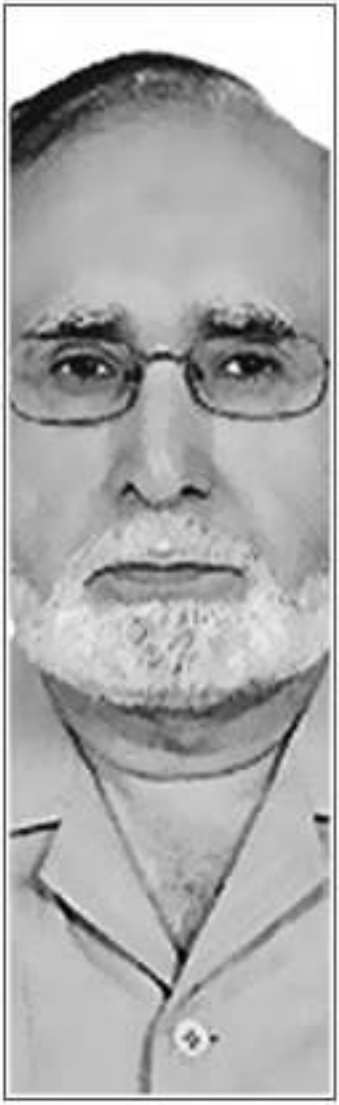

ہمت کرنی ہو گی ہم کو، لڑنا ہے تقدیروں سے
یہ تو رستہ روکیں گی ہی، اُلجھو مت زنجیروں سے

دیکھو اِک دن گھر والے بھی تم کو پاگل کہہ دیں گے
دن بھر باتیں کرتے ہو تم اِن گونگی تصویروں سے

یوں تو تم بھی سوچ سمجھ کر لکھتے ہو اخباروں میں
دل کی باتیں پھر بھی ظاہر ہوتی ہیں تحریروں سے

تم بھی لیڈر بن سکتے ہو، سادہ سے اِن لوگوں کا
مجمع خوب لگا لیتے ہو ہر جا تم تقریروں سے

باندھ کے رکھ لو، رکھ سکتے ہو گر تم اِن کے جسموں کو
سوچیں بھی کیا رُک سکتی ہیں لوہے کی زنجیروں سے؟

دستِ شفا کا حامل تھا تُو، جب تک نیت خالص تھی
اب تو سارے نسخے تیرے خالی ہیں تاثیروں سے

سپنے دیکھو لیکن ان کو سپنے ہی بس سمجھو تم
اتنی بھی مت آس لگاؤ خوابوں کی تعبیروں سے

گر تم چاہو، یاروں کی یہ بزم سدا آباد رہے
صَرفِ نظر پھر کرنا ہو گا، اِن سب کی تقصیروں سے

سید ضیا حسین

غزل

ضیا الرشید

در در ہو کر خوار ہوا
پھرتی ہے ناچار ہوا

اندر جلتے آتشدان
باہر ٹھنڈی ٹھار ہوا

چہرے زرد گلابوں کے
پژمردہ بیمار ہوا

تجھ کو بھی مطلوب ہے یہ
مجھ کو بھی درکار ہوا

ہاتھ میں اندھے قاتل کے
دو دھاری تلوار ہوا

یوں گلشن تاراج نہ کر
اے ظالم تاتار ہوا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کتنے دن کے بعد ملے تھے
یاد کیا تو یاد نہ آیا

غزل

کب کسی خیر و شر میں رہتے ہیں
لوگ اپنے سفر میں رہتے ہیں

جسم تھک جاتے ہیں مشقت سے
حوصلے بال و پر میں رہتے ہیں

ایک مانوس اجنبی کی طرح
آپ کی رہ گزر میں رہتے ہیں

وہ بھی پتھر اُٹھائے رکھتا ہے
ہم بھی شیشے کے گھر میں رہتے ہیں

جو کسی داستاں کا حصہ تھے
قصۂ مختصر میں رہتے ہیں

خود پہ اپنا گمان تک بھی نہیں
ہم کسی کے اثر میں رہتے ہیں

آندھیوں کو غرض ہو کیوں عاصمؔ
گھونسلے کچھ شجر میں رہتے ہیں

عاصم اعجاز

غزل

اک کہانی میں سو کہانیاں ہیں
اپنی اپنی الگ زبانیاں ہیں

جو نہ تھیں ماننے کے قابل بھی
دل نے ایسی بھی باتیں مانیاں ہیں

ایک رومال ایک خط اک کارڈ
یہ مرے پیار کی نشانیاں ہیں

رنجشیں آج بھی ہیں ساتھ مرے
کچھ نئی اور کچھ پرانیاں ہیں

کچھ خبر بھی ہے تجھ کو، تیرے لئے
منتیں کتنی ہم نے مانیاں ہیں

کیفی قلندر

کیسا آہنگ ہے ترنم ہے
اور مصرعوں میں کیا روانیاں ہیں

میرا دل بھی یقیں سے کوسوں دور
اس کے دل میں بھی بدگمانیاں ہیں

ہم صدا دیں گے چارسو صاحب
یاریاں بھی تو آزمانیاں ہیں

غزلیں

ہر ایک شخص پڑھانے لگا نصابِ جہل
سواب نہیں ہے سماعت کو کچھ بھی تابِ جہل

سب اپنی خواہشیں خبریں بنا کے پیش کریں
مسلط ایسے وطن پر ہوا عذابِ جہل

تمام عمر جنہیں بحرِ علم سمجھا ہے
زبان کھولیں تو کھلتا ہے ایک بابِ جہل

سراغ کیسے حقیقت کا لوگ پائیں گے
جو سچ کے چشمے سے اچھا لگے سرابِ جہل

مکالمہ و مباحث ضروری ہیں جاذبؔ
نہ عقل سہہ نہیں سکتی مگر عتابِ جہل

اکرم جاذب

نئی رتوں سے مرے دوست بس یہی گلہ ہے
سراغ بچھڑے ہوئے یار کا نہیں ملا ہے

جو ایک ہوتا تو ممکن تھا کام دوسرا بھی
نہ وہ ملے ہیں نہ یہ چاکِ پیرہن سلا ہے

محبتوں میں یہ کن دائروں کو لے بیٹھے
حدِ گماں سے بھی آگے تلک یہ سلسلہ ہے

جہاں کو بیچ سے اپنے ہٹا چکے لیکن
انا کا سنگِ گراں ہم سے بھی نہیں ہلا ہے

ہزار لطف و کرم اس کے ماسوا بھی ہیں
فقط جدائی کہاں اپنے شوق کا صلہ ہے

مہک سی لفظوں سے آنے لگی ہے پھر جاذبؔ
کوئی گلاب سرِ شاخِ آرزو کھلا ہے

غزل

کسی کو سوچ کا محور بنایا جائے گا
پھر اس کے بعد اسے دل میں لایا جائے گا

بنایا جائے گا اس کو ضروری اپنے لیے
پھر ایک روز اسے بھی بھلایا جائے گا

اے کوزہ گر مجھے اتنا بتا دیا جائے
مرا خمیر کہاں سے اٹھایا جائے گا

شعور ذات سے آگے اگر میں بڑھ پایا
چراغ عشق بھی اک دن جلایا جائے گا

کیا گیا ہے یہ وعدہ بھی میرے ساتھ ایاز
مجھے بھی خود سے کسی دن ملایا جائے گا

محمد علی ایاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چار جانب وہی دھندلکے ہیں
گمرہو! پھر وہی گلی آئی

غزلیں

وہ نظر مہربان ہے شاید میں نے ذرے میں جھانک کر دیکھا
پھر مرا امتحان ہے شاید بے کراں اک جہان ہے شاید

پھر تری جستجو میں نکلا ہوں میں اسے بھول بھی تو سکتا ہوں
پھر جہاں درمیان ہے شاید یہ بھی میرا گمان ہے شاید

صرف اہلِ نظر پہ کھلتی ہے
خامشی اک زبان ہے شاید

اظہر حسین اظہر

اِدھر سے گزرو تو دیکھو اے خوش گمان ہَوا
بکھر نہ جائے کہیں ریت کا مکان ہَوا

سماعتوں کا چمن زرد ہو چکا ہے یہاں
سُنے گا کون تری بات بے زبان ہَوا

ابھی کلی میں مُقیّد ہے اک زرِ خوشبو
ابھی تو بند ہے پھولوں کی وہ دُکان ہَوا

کوئی دریچہ کبھی اُس پہ کُھل نہیں سکتا
ہزار دستکیں دے گرچہ بے زُبان ہَوا

بھٹکتی پھرتی ہے دنیا میں جانے کس غم میں
تو ہم پہ کھول بھی دے اپنی داستان ہوا

کسی کی یاد کی خوشبو سے آج پھر احمد
بسا کے چھوڑ گئی ہے مِرا مکان ہَوا

عتیق احمد

غزل

امر مہکی

معصوم چاہتوں کا بھی کیا سلسلہ رہا
دیوانگی تھی اور گریباں سِلا رہا

نادان سی لگن میں عجب احتیاط تھی
نزدیکیوں کے سحر میں بھی فاصلہ رہا

آئی ہے زندگی میں خزاں بارہا مگر
جو پھول شاخِ دل پہ کِھلا تھا، کِھلا رہا

وہ چاند تھا کہ چہرہ کسی کا تھا جھیل میں
منظر میں اور ہی کوئی منظر مِلا رہا

جنموں کی پیاس بجھ نہیں پاتی کبھی امر
صحرا کو بارشوں سے ہمیشہ گِلہ رہا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

محفلِ ماہتاب میں نجمِ سحر نہیں تو کیا
لاکھ نیاز مند ہیں، ایک اگر نہیں تو کیا

غزل

میتھیو محسن

کسی سے عہد محبت وفا نہیں ہوتا
تو اُس سے جینے کا حق بھی ادا نہیں ہوتا

نہ جانے بھید ہے کیا رشتۂ محبت میں
کسی کو اِس میں کبھی حق عطا نہیں ہوتا

ہر اک زبان پہ سچ اک سوال ہے لیکن
کسی زبان سے یہ فرض ادا نہیں ہوتا

قدم قدم ہے مجھے واسطہ گمانوں سے
بتوں سے خالی کوئی راستہ نہیں ہوتا

بس ایک بار ہی تم اس پر مر مٹو محسن
یہ روز روز کا مرنا بھلا نہیں ہوتا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جاگ رہا ہے تُو مجھ میں
یا ، تیری خو بو مجھ میں

غزلیں

اپنے ہونٹوں سے گل فشانی کی
آج اس نے بھی مہربانی کی

پھول کاڑھے پھر ان کو پانی دیا
میں نے تکیے پہ باغبانی کی

تتلیاں پھول جان کر آئیں
اس کی تصویر پر، جوانی کی

کس قدر پرسکون ہے دریا
یار تصویر کھینچ پانی کی

امجد نذیر

دکھا کے صبح ہمیں، رات کرنے والا تھا
ہمارے ساتھ کوئی ہاتھ کرنے والا تھا

ستارے، پھول سبھی جھولیاں لیے پہنچے
وہ اپنے حسن کی خیرات کرنے والا تھا

پھر اک پیادے کو قربان کر دیا میں نے
وہ بادشاہ کو شہ مات کرنے والا تھا

مجھے بلایا تھا تالاب کے کنارے پر
وہ چاند مجھ سے ملاقات کرنے والا تھا

ایک کردار کے نکالنے سے
چاشنی بڑھ گئی کہانی کی

چند مشکل سے لفظ بولے اور
گاؤں والوں پہ حکمرانی کی

کہ پہلے بند کرائی گئی تھیں آنکھیں مری
ضرور خواب طلسمات کرنے والا تھا

کسی شکستہ چٹائی پہ بیٹھ کر امجد
فقیر سیرِ سماوات کرنے والا تھا

غزل

ہر طرف نغمگی محبت ہے
چاند کی چاندنی محبت ہے

جوت آنکھوں میں جاگ اٹھتی ہے
روح سے پھوٹتی محبت ہے

تم ضرورت مرے وجود کی ہو
اک نئی روشنی محبت ہے

دو دلوں کو ملا دیا اس نے
پھول کی تازگی محبت ہے

چاند سورج کے درمیاں رشتہ
تا ابد دائمی محبت ہے

تم ہو پہلو میں اک غزل کی طرح
اور یہ شاعری محبت ہے

اب کسی وہم میں نہیں رہنا
تم سے اب واقعی محبت ہے

داستاں اب نئی بنے گی نہیں
"تو مری آخری محبت ہے"

رخسانہ سمن

غزل

بن تو گئی ہے زندگی اشباہِ نیم شب
لیکن ہوئی نہ پوری ابھی چاہِ نیم شب

ہے رات گریہ گاہ تری اشک اشک رو
کیوں گھٹ کے مر رہا ہے مرے ماہِ نیم شب

اک دو پلک کی نیند کو آنکھیں ترس گئیں
شاید کہ لگ گئی ہے انہیں آہِ نیم شب

حالانکہ یہ سفر تو بہت دیر کا نہیں
لیکن مجال ہے کہ کٹے راہِ نیم شب

دامن چھڑا کے مجھ سے گزر جائے نہ کہیں
میں روک کر کھڑا ہوں گزرگاہِ نیم شب

دل ہے یا کوئی ہجر زدہ دشتِ ریگزار
آنکھیں ہیں یا کہ درد کی درگاہِ نیم شب

چل تو پڑا ہوں ساتھ مگر یہ خبر نہیں
لے جائے گی کہاں پہ یہ گمراہِ نیم شب

پہلے پہل تو جاگتے ہیں اشتیاق سے
کرتا ہے کون بعد میں پرواہِ نیم شب

صدیوں پہ پھیلی لمبی مسافت ہے سامنے
اک میں ہوں اور ایک ہے شاہراہِ نیم شب

علی رضا بلوچ

غزل

سینے پہ سل پڑی ہے مجھے لگ رہا ہے آج
دل جس جگہ کبھی تھا وہاں آبلہ ہے آج

جب تم نہیں رہے تو یہاں کب رہی ہوں میں
دکھ کے سوا حیات میں کیا رہ گیا ہے آج

کس موڑ پر ہیں لائے یہ حالاتِ زندگی
ہم زندگی سے زندگی ہم سے خفا ہے آج

آتی ہے ٹوٹنے کی بدستور اک صدا
سینے سے میرے شور یہ کیسا اٹھا ہے آج

دنیا کے غم سہے ہیں تمھارا نہ سہہ سکی
لگتا ہے جیسے مجھ میں کوئی مرگیا ہے آج

جکڑا ہوا ہے درد نے مٹھی میں یوں سحر
کس غم نے زہر دھڑکنوں میں بھر دیا ہے آج

نادیہ سحر

غزل

عالَمِ اضطراب میں گزری
زیست پیہم سراب میں گزری

وقت کے داؤ پیچ تھے ایسے
زندگی احتساب میں گزری

حاصلِ عمر کی طلب میں دوست
جو بھی گزری حباب میں گزری

زندگی ساری رند کی افسوس
مست ہو کر شراب میں گزری

رنج پہچان جاتے ہیں ہر بار
بارہا میں نقاب میں گزری

اک شناور کی دوستی میں عمر
خاک میں مِل کے، آب میں گزری

سامنے کچھ ہیں لوگ پیچھے کچھ
ہست اِسی پیچ و تاب میں گزری

تھا ہر اک سے گریز پہلے ہی
خود سے بھی اجتناب میں گزری

زندگی تھی اَدا مجاہد کی
مستقل انقلاب میں گزری

روگ ایسا غنیمِ جاں سے ملا
عمر پل پل عتاب میں گزری

لبنیٰ مقبول غنیم

غزل

تم کوئی مجھ سے محبت کے لیے آئے ہو
تم تو بس اپنی سہولت کے لیے آئے ہو

جانتی ہوں کہ نہیں آئے ہو تم میرے لیے
تم فقط اپنی ضرورت کے لیے آئے ہو

تم تو ڈرتے ہو کہ دنیا میں تماشا نہ بنے
صاف ظاہر ہے کہ خلقت کے لیے آئے ہو

جو بھی چاہو وہ کرو، تم کو کھلی چھٹی ہے
تم اگر مجھ سے اجازت کے لیے آئے ہو

اس دکھاوے کی محبت سے مجھے باز رکھو
لوگ سمجھیں گے کہ شفقت کے لیے آئے ہو

شفقت حیات شفق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سوچو تو کچھ نہ سمجھو، سمجھو تو کچھ نہ بولو
پھر چپ کا حسن دیکھو، بیکار لب نہ کھولو

غزل

اپنی زلفوں کو پریشان بھی کرسکتی ہوں
آپ سے پیار کا پیمان بھی کرسکتی ہوں

آپ کے نام پہ قربان بھی ہوسکتی ہوں
دفعتاً آپ کو حیران بھی کرسکتی ہوں

اِس محبت کے لئے جان بھی دے سکتی ہوں
اور فدا حسرت و ارمان بھی کرسکتی ہوں

آپ کی یاد کی قندیل جلاسکتی ہوں
دل کا آباد یہ زِندان بھی کرسکتی ہوں

میں تو اے شخص! ترا ساتھ نبھانے کے لئے
وقف یہ جان بھی اور آن بھی کرسکتی ہوں

اے زمانے! ترے آلام اٹھانے کے لئے
خود کو آرام سے ہلکان بھی کرسکتی ہوں

اک ذرا دل ہے جیا، اس میں توقف کیسا
دل تو آرام سے میں دان بھی کرسکتی ہوں

جیا قریشی

غزل

ہر خوشی اتنی واجبی کیوں ہے
غم سے دل کی یہ دوستی کیوں ہے

اُس کو کہتے تھے زندگی اپنی
وہ نہیں ہے تو زندگی کیوں ہے

ایک ساگر تھا گویا پیار اُس کا
پی کے ساگر بھی تشنگی کیوں ہے

بے حسی میں بھی ہو ہی جاتی بسر
زندگی اتنا سوچتی کیوں ہے

گر نہیں غم جدائی کا کوئی
تیری آنکھوں میں یہ نمی کیوں ہے

دل کے آنگن میں ہیں اندھیرے کیوں
راستوں میں یہ روشنی کیوں ہے

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چٹختے تن! دھکتے تازیانے
سِتم ، آواز میں ڈھلتے رہیں گے

غزل

کسی حصار کی خواہش میں بے اماں ہوں گے
ہم ایسے لوگ بہت جلد داستاں ہوں گے

قفس نصیب ہیں لیکن اُمید رکھتے ہیں
سرِ اُڑان کبھی اپنے آسماں ہوں گے

جہانِ خواب میں رہتے تھے تیرے ملنے تک
خبر نہ تھی مرے آگے بھی لامکاں ہوں گے

لطیف لہجوں سے مرعوب ہوں نہ حضرتِ دل
مبادا تلخ نوائی سے کل بیاں ہوں گے

انا و ضد بھی ہماری انھیں عزیز رہی
خبر نہ تھی کہ وہ اس درجہ مہرباں ہوں گے

ہوا سے کتنا بچا سکتے ہیں دیے کو ردا
اگر ہے بخت میں ہونا تو ہم دھواں ہوں گے

ردا حاصل خلوص

غزل

کچھ اسطرح سے ہوئی عشق میں ہتک میری
کہ اشک اشک بھگوئی گئی پلک میری

تم اپنے باغ عدن پر نہ اتنا اتراؤ
کہ گل تمہارے ہیں سارے مگر مہک میری

تڑپ تڑپ کہ غموں کا نگر رہے آباد
کہ ختم ہو ہی نہ جائے کہیں کسک میری

خدایا شکر، کہ اس نے رکھے قدم دل پر
وگرنہ کتنی ہی ویراں تھی یہ سڑک میری

پھر ایک سَمت سے اُبھری وہ آفتاب نظر
کہ ماند پڑنے ہی والی تھی سب چمک میری

بھری تھی ایک ہی جست آسماں کی جانب اور
زمیں نے کھینچ لیا دیکھ کہ اچک میری

پھر ایک لب سے اٹھا استغاثۂ ہل مغیز
پھر اک زمانہ اٹھا بڑھ گئی کمک میری

انتظار سید

غزل

تمہارا حسن چمن میں گلاب کی مانند
تو ہے جوانی میں ہلچل چناب کی مانند

میں اپنے دل کا دریچہ تو کھول دوں لیکن
اگر نہ خواب میں آئے وہ خواب کی مانند

وہ ایک شخص کبھی اجنبی تھا لیکن اب
رہے گا زیست میں شامل نصاب کی مانند

خزاں کے دور میں کوئی بہار جیسی مے
ہمیں بھی کاش پلائے شراب کی مانند

تمہارا نام ہی اس میں لکھا ہوا ہے دوست
ہمارا دل ہے وفا کی کتاب کی مانند

بسی ہوئی ہے جو صورت ہماری آنکھوں میں
وہ زرد پھولوں میں ہے اک گلاب کی مانند

ادائے فرض میں سجدے قضا ہوئے ناصرؔ!
بہت سے فرض ہیں واجب جناب کی مانند

عامر عباس ناصر اعوان

غزل

جس طرف جائیں وہ رستے میں کھڑی ہوتی ہے
ہم سے لوگوں کی انا قد سے بڑی ہوتی ہے

ضد کسی سے بھی تعلق نہیں بننے دیتی
کبھی خود سے، کبھی دنیا سے لڑی ہوتی ہے

رات گر دیکھ لیں ہم خواب ڈرانے والے
صبح دہلیز پہ تعبیر پڑی ہوتی ہے

مبتلا حشر کے عالم میں خدا رکھتے ہیں
ہر گھڑی اپنی قیامت کی گھڑی ہوتی ہے

ہم وہ مرکب ہیں جو تھک کر بھی نہیں رک سکتے
دست راکب میں ہر اک آن چھڑی ہوتی ہے

ہم تو بس عرضِ ہنر کرتے ہوئے مارے گئے
گونگوں، بہروں کی یہاں عمر بڑی ہوتی ہے

دیکھتے جاتے ہیں چہروں کو یوں مرنے والے
بات جیسے کوئی ہونٹوں پہ اُڑی ہوتی ہے

کھائے جاتی ہے ہمیں شعر کی تخلیق کی فکر
اور گھر والوں کو جینے کی پڑی ہوتی ہے

کاش بادل مری دھرتی پہ کبھی یوں برسیں
جیسے مظلوم کے اشکوں کی جھڑی ہوتی ہے

علمدار حسین

غزل

اپنی قسمت میں کام لکھا تھا
صبح لکھا تھا شام لکھا تھا

ہم نے جو بھی کلام لکھا تھا
اس کو تیرے ہی نام لکھا تھا

تیرے ابرو کو تیغ سمجھے تھے
تیرے ہونٹوں کو جام لکھا تھا

لکھنے والے نے امن کو شاید
اس جہاں میں حرام لکھا تھا

کچھ بھی لکھا گیا نہ خاص کبھی
جو بھی لکھا تھا عام لکھا تھا

وصل لکھا تھا دو گھڑی کے لیے
ہجر کو پھر دوام لکھا تھا

پختہ لکھا تھا عشق کو کس نے
عقل کو کس نے خام لکھا تھا

دھوکہ دینے کے واسطے اس نے
دل پہ میرا ہی نام لکھا تھا

جانے کتنے جہان تھے باقی
جن پہ میرا قیام لکھا تھا

عطاالعزیز

غزلیں

نیند اتری نہ خواب اترے ہیں
دل پہ شب بھر عذاب اترے ہیں

چاندنی اور جگمگانے لگی!!
رات کیا کیا حجاب اترے ہیں

اک گلہ خود سے جو کیا میں نے
لاکھ اس کے جواب اُترے ہیں

پڑھ کے جن کو قرار کھو جائے
دل پہ ایسے نصاب اُترے ہیں

روشنی اور بڑھ گئی شاہد
بام پر آفتاب اترے ہیں

رانا محمد شاہد

غم بٹائے جا رہے ہیں
دل جلائے جا رہے ہیں

نفرتوں کا جال ایسا
گھر گرائے جا رہے ہیں

منزلوں کی چاہ کس کو
ہم تو جائے جا رہے ہیں

آشتی کے سب پرندے
اب اُڑائے جا رہے ہیں

رنج دے کر دوسروں کو
مسکرائے جا رہے ہیں

روز بڑھتی قیمتوں کے
بم گرائے جا رہے ہیں

مرحلہ در مرحلہ ہم
آزمائے جا رہے ہیں

غزل

وہ تیز رَو تھا مگر رُک کے دیکھنا اُس کا
مسافروں پہ تو عُقدہ نہ کھل سکا اس کا

وہ نیک دل ہے، بھلا ہے، خُدا شناس بھی ہے
کسے روا ہے کہ دل سے کرے گلہ اُس کا

وہ میرے نام کی تسبیح کیوں نہیں کرتا
محبتوں میں رویہ ہے عام سا اُس کا

کسی کسی کو بناتے ہیں رازدار اپنا
کسی کسی کو سناتے ہیں مرثیہ اُس کا

جمالِ یار کا نقشہ کہیں سے کھینچتا ہے
وَرائے فہم سے اُٹھتا ہے زاویہ اُس کا

یہ لگ رہا ہے محبت کی عمر ختم ہوئی
کہ ہجر پھیلتا جاتا ہے جا بجا اُس کا

وہی عدنؔ جو ستاروں کی بات کرتا تھا
خود اپنا چاند تو گہنا کے رہ گیا اُس کا

شعیب عدن

غزل

طیش میں نکلا تھا سو گھر بھی نہیں جا سکتا
دل کا آسانی سے یہ ڈر بھی نہیں جا سکتا

پہلے موجودگی کافی تھی، مگر اب دل کو
وسوسہ ایسا ہے چھو کر بھی نہیں جا سکتا

سوئے جو مجھ کو بلاتا ہے کوئی ناقہ سوار
خیمۂ دشت سے باہر بھی نہیں جا سکتا

حجرۂ دل کبھی آلودۂ خواہش نہ ہوا
دشت کے پار سمندر بھی نہیں جا سکتا

مجھ کو کیا علم، کبوتر مری چھت پر اترے
ایسا موسم ہے کہ چھت پر بھی نہیں جا سکتا

رکھے جاتا ہوں میں نیچے ہی کہیں اپنی تھکن
اس بلندی پہ تو بستر بھی نہیں جا سکتا

جاگتی آنکھ میں گھمسان کا رن ہے قاسم
جانبِ خواب یہ لشکر بھی نہیں جا سکتا

قاسم حیات

غزل

یہ وقت صورتِ صحرائے گرد کُھلتا ہے
فراق رُت میں ہی مجھ پر وہ فرد کُھلتا ہے

ہر اک پہاڑ سے چشمہ اُبل نہیں سکتا
بہت سی برف گرے تو یہ درد کُھلتا ہے

سخن شناس ہی دے داد مجھ کو شعروں کی
کہ غوطہ زن پہ ہی دریا نورد کُھلتا ہے

مرے نقوش جو مرجھا رہے ہیں، لگتا ہے
ترے وجود کا ہر لمس سرد کُھلتا ہے

کوئی ہتھیلی بھی تشنہ نظر نہیں آتی
اس اہتمام سے وہ دستِ مرد کُھلتا ہے

علی حیدر علوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چاند کے ساتھ چلے ہم ، شب بھر
صرف ہوا نے ساتھ نبھایا

غزل

عشق کرنے کا اختیار ملا،
خود سے خود لڑ مرے تو پیار ملا

ہجر کی بات غم کے قصے میں
گھٹتی بڑھتی ہوئی پھوار ملا

دیکھ میں آدمی ہوں ہجر زدہ،
میری چائے میں تھوڑا پیار ملا،

کوک کوئل کی چیخ بلبل کی
دونوں سے تو مری پکار ملا،

زندگی خود بھی ایک وقفہ ہے
اور وقفے میں انتظار ملا

سب سے ملتا ہوں تیرے کہنے پر
تو مرا رب ہے میرا یار ملا

اک سمندر ہے بیتے لمحوں کا
اس سمندر سے دور پار ملا

اعجاز رضوی

شفق کے رنگوں کی دھنک

وہ دلکش...دبلی پتلی سمارٹ سی لڑکی...جو کوئی بھی اس کو دیکھتا تو اسے یوں لگتا کہ یہ عام سی لڑکی نہیں ہے۔ یہ خاص لڑکی جس کو قدرت نے اپنی پہلی فرصت میں بنایا ہے...اس قدر نازک مزاج تھی کہ کسی منفی رویے کو برداشت نہیں کرسکتی تھی...اس کی اپنی ہی الگ تھلگ خوبصورت دنیا تھی...والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو چکا تھا...اور دادا ہاشم نے بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا...ہر کوئی اسے پیار کرتا تھا...دادا کی دلاری آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔

ایم اے فائنل میں جب پہنچی تو دادا کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ جب اسے کوئی رشتہ دکھایا جاتا تو دادا سے کہتی میں شادی نہیں کروں گی۔ اگر مجبور کریں گے تو میری پسند کا لڑکا ڈھونڈیں...جو دنیا کے تمام لڑکوں سے افضل اور لائق ہو...بس کہہ دیا سو کہہ دیا۔

ہاشم صاحب نے کہا۔

بس لڑکا سمجھ لو مل گیا...آج جس کھانے میں مدعو ہیں وہاں بہت سے دوستوں کی بیٹیاں آرہی ہیں...وجہ یہ ہے کہ ہمارے دوست تنویر کا بیٹا امریکہ سے نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آیا ہے بلکہ کئی امریکی سٹوڈنٹس سے برتری حاصل کر کے اپنا لوہا منوا چکا ہے .....بہت سی بیماریوں پر ریسرچ (Research) کیا ہے...اور بتا رہا ہے کہ کرونا وائرس پر پوری تحقیق کر رہا ہوں...اس کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور رشتہ تمہارے لئے موزوں نہیں ہے۔

تمام دوستوں کی بیٹیاں بھی آئیں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ شہاب تمہیں پسند کر لے۔ جانتی ہو...اس کے چرچے دور دور تک پھیلے ہیں...اتنا ہونہار نوجوان ہے۔

''دادا ابو'' سحر نے کہا۔

''چرچوں سے کیا ہوتا ہے بس میری پسند بھی تو مختلف ہے...میرے بارے میں وہ سوچیں اور ریسرچ کرتے کرتے...صرف میں اور صرف مجھے افضل جانے''۔

بلقیس ریاض

''اتنی معنی سی میری پوتی ہے...وہ ضرور ایسا ہی ہوگا بلکہ جب میں نے دیکھا تو یوں لگا قدرت نے تمہارے لئے تخلیق کیا ہے...یہی وہ لڑکا ہے جس کی تمہیں تلاش ہے''۔ میرے پیارے دادا ابو وہ ہاشم صاحب کے گلے لگ گئی۔

رات کو تنویر میاں کے گھر خوب گہما گہمی تھی...نوجوان لڑکیاں پارلروں سے میک اپ کروا کر گھڑی دو گھڑی کے لیے حسین دکھائی دے رہی تھیں...سحر نے ہلکا ہلکا سا میک اپ اور بڑا ہی سٹائلش لباس پہنا ہوا تھا...دراز بال اس کی شانوں میں لہرا رہے تھے...شہاب اس محفل میں لڑکیوں کے جھرمٹ میں راجہ اندر دکھائی دے رہا تھا۔ پھر سب سے مل کر سحر سے ہاتھ ملایا تو اس نے اپنی حسین روشن آنکھوں سے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس کو یوں لگا جیسے یہ وہی ہے...جس کی مجھے تلاش تھی۔ پھر...شہاب نے اسی رات اپنے باپ سے کہا وہ سحر سے شادی کرے گا...اور ہاشم میاں کی جیسے مراد پوری ہوگئی...اور سحر شہاب کے گھر دلہن بن کر آ گئی..ہنی مون کے لیے وہ کوہ مری چلے گئے...پورا دن شہاب کا سحر کے ساتھ اچھا گزرا دونوں نے پہاڑوں کے بیچوں بیچ خوب سیر کی...اور سحر سے باتیں کرتے کرتے کچھ سوچتا اور خاموش ہو جاتا۔ سحر نے اسے کہا۔ کہاں کھو گئے ہیں۔ دیکھیں آسمان اتنا روشن ہے اور پورا تاروں کی روشنی سے لبریز ہے...کہکشاں اتنی نزدیک نظر آ رہی ہے...

آس پاس کے پودے اور کیاریاں پھولوں سے بھری ہیں... ان پر نظر دوڑائیں... مگر...شہاب کی آنکھوں میں بیزاری ٹپک رہی تھی...اور یہ بیزاری سحر کا وجود چھلنی کر گئی تھی۔

شادی کے دوسرے روز ہی ناخوشگوار زندگی کی ابتدا ہو گئی تھی۔ پھر اس نے سوچا بہت بڑی بھول ہوئی مجھے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی...اور شہاب اپنے مشن کو مکمل کرنے کے لیے چار دن کے بعد ہی جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا...سحر کو ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا وہاں اور ڈاکٹرز بھی اسی لیے آ رہے تھے۔

جب پیکنگ ہو گئی تو غروب آفتاب کا وقت ناقابل بیان تک دلکش تھا اور حسین منظر تھا آسمان میں شفق کے کئی رنگ نظر آ رہے تھے...دلفریب منظر کو دیکھ کر وہ اس کے بازوؤں میں سماتے ہوئے بولی۔

مجھے محبت...اور محبت کی ضرورت ہے...بہت سال میں نے انتظار کیا تم ملے اور مجھے منجھدار میں چھوڑ کر جانے لگے ہو...اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

ماتھے کی شکنیں گہری ہو گئیں...تو بولا۔

میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں...مگر اپنے اور کام میں انتہا درجے کی لگن ہے...یہ خوبصورت آرام دہ گھر...صرف تمہارے لئے ہے۔ دولت جو دن رات کی کمائی سے اکٹھی کی ہے... وہ بھی تمہارے لئے تاکہ تم آرام سے رہو۔

مجھے بھی تمہاری طرح کی بیوی چاہیے تھی جو اس گھر میں سج جائے...سحر کی آنکھوں میں

نفرت جھلکنے لگی... اور وہ چلا گیا۔
وہ اپنے بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تیز ہوا سے کھڑکی کے پٹ پھڑ پھڑانے لگے... ہواؤں کی تیزی سے موسلا دھار بارش کے قطروں کی بھی گونج تھی۔ آسمان پر بجلی چمکی اور پہاڑوں کی چوٹیاں... تاریکی میں ڈوب گئی تھیں... زوردار طوفان آ گیا تھا اس نے کھڑکی بند کی۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ کمرہ میں بھی آسمانی بجلی گر جائے گی۔ شروع سے ہی بجلی سے ڈرتی تھی۔
ابھی اپنے آپ کو سنبھال ہی نہیں پائی تھی کہ شہاب کا فون آ گیا... گھنٹی کی آواز سے اس کا دل لرز گیا۔
''کیسی ہو''... شہاب نے پوچھا۔
''بہت ڈر لگ رہا ہے... بہت زور دار طوفان ہے''۔
''اچھا میں ایان کو بھیج دوں گا۔ وہ انیکسی میں رہے گا اور تمہارا پورا خیال رکھے گا''۔
''ایان کون''
''میرا جونیئر ڈاکٹر ہے''۔
ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے... بہادر بنو... اور ان شاء اللہ کل پہنچ جائے گا۔
''اور تم''
میں جب تک ریسرچ مکمل نہیں ہوتی میں نہیں آؤں گا۔ فون پر بات ہوتی رہے گی اور فون بند ہو گیا۔
سحر ایک بار پھر بستر پر گر گئی... درختوں کے پتوں کی وجہ سے سرسراہٹ اور طوفان کی وجہ سے ماحول کی وحشت میں اضافہ ہو گیا تھا... اور پھر اٹھی اور کھڑکی کو بند کر دیا۔
دوسرے دن آسمان سیاہ بادلوں کی وجہ سے ڈھکا ہوا تھا... کہیں کہیں سورج کی کوئی کرن زمین کو ہلکا سا روشن کرتی اور دوبارہ گم ہو جاتی... اس نے اتنا حسین منظر دیکھ کر بھی رونا شروع کر دیا تھا... کھلی کھڑکی سے سارا باغ ضرورت سے زیادہ نکھرا ہوا تھا... بارش نے پودوں اور درختوں میں نکھار پیدا کر دیا تھا...
پھر ناشتہ کی میز پر ملازم ایان کو اندر لے کر آیا تو... سحر نے اس کی جانب دیکھا... اونچا لمبا ہینڈسم لڑکا... اس کے سامنے کھڑا تھا۔
میڈم گڈ مارننگ... میں... وہ اپنے بارے میں بتانے ہی والا تھا کہ سحر نے کہا۔
''ہاں ایان''
میں سلام کرنے آیا تھا... اب آ گیا ہوں تو... آپ کو کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔
''ٹھیک ہے... انیکسی میں جا سکتے ہو... ناشتہ وہیں پہنچ جائے گا''۔
ناشتہ کا تکلف نہ کریں... میں کر کے آیا ہوں... اور وہ باہر نکل گیا... سحر... بے اختیار دل ہی دل میں کہہ اٹھی... کتنا ہینڈسم ہے۔
جب تیار ہو کر باہر برآمدے میں آئی تو ہر سو سبزہ ہی سبزہ دکھائی دے رہا تھا۔
ایان انیکسی سے سیدھا اس کی جانب آیا۔
''میڈم''
''کہو''

شہاب صاحب کو جب معلوم ہوا کہ آپ کو رائڈنگ کا بہت شوق ہے تو دو گھوڑے اچھی نسل کے فارم ہاؤس کے اصطبل میں بھیج دیے ہیں...آج تو بہت کیچڑ ہوگا۔ کل ان شاء اللہ دور فارم ہاؤس کی میلوں لمبی سڑک پر رائڈنگ کریں گے...سحر ایک دم سے مسکرائی۔ وہ نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے۔

"اوہ شور (oh sure)"

ایسی جگہ پر رائڈنگ کرواؤں گا جہاں قدرت کے حسین مناظر سے آپ لطف اندوز ہوں گی۔

تو تمہیں بھی نیچر کا حسن پسند ہے۔

"بہت میڈم... سارا دن خوش رہتا ہوں...رنگا رنگ کے پھول دیکھ کر"۔

سحر بچوں کی طرح خوش ہوگئی...اس ویرانے میں ایان کے آنے سے اسے بہت ڈھارس بندھی...اور حیرت میں مبتلا تھی...اور سوچ رہی تھی...کہ اپنے پیشے کے علاوہ قدرتی حسن کو بھی پسند کرتا ہے۔

بہت آرام دہ گھر اور ہر طرح کی سہولتیں دی ہیں وہ بہت خوش رہے گی اور وہ اطمینان سے اپنا کام کرتا رہے گا۔ اول تو اس نے سوچا تھا کہ شادی نہیں کرے گا جب تک اپنا پروجیکٹ مکمل نہ ہو مگر پھر خیال آیا...اس حسین گھر میں ایک حسین لڑکی کا ہونا بہت ضروری ہے...اس کے ہونے سے گھر میں چار چاند لگ جائیں گے۔

روز وہ ایان کے ساتھ رائڈنگ کر رہی تھی۔ پہاڑوں کے بیچوں بیچ، کھیتوں اور کھلیانوں پر ایک حسن تھا...رائڈنگ کرتے ہوئے اس نے ایان سے پوچھا۔

تمہارے آباؤ اجداد کہاں کے ہیں کیا تم بھی اسی شہر کے رہنے والوں میں سے ایک ہو۔

میں ایک متوسط گھر کا چشم چراغ ہوں...ہم لوگ بھی اسی شہر میں رہتے ہیں...مگر جب تک شہاب صاحب نہیں آتے میں انیکسی میں ہی رہوں گا۔

"شکریہ"

سحر نے اس کی جانب دیکھا...تو ایان نے اپنی روشن اور چمکتی آنکھیں سحر کی طرف کر دیں...نہ جانے اس کی آنکھوں میں کیا جادو تھا کہ سحر کچھ دنوں میں ہی اس کی عادی ہو گئی۔ میڈم بڑی مشکل سے میں نے ڈاکٹری پاس کی ہے...قدم قدم پر شہاب صاحب نے میری مدد کی ہے۔

"بے چارہ"...سحر نے دل ہی دل میں کہا...اور رائڈنگ کے بعد اس نے ایان کو بھی لنچ ساتھ کروایا...وہ کہنے لگا۔

میڈم شام کو میں بڑی ہی حسین جگہ پر لے کر جاؤں گا۔ باہر کے ملکوں میں ایسا حسن نہیں دیکھا ہوگا جو یہاں پر ہے۔ خدا اور اس کی خدائی یاد آتی ہے...سحر نے اس کی جانب دیکھا...وہ مخمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

شام کے وقت سحر اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر خوبصورت مناظر کا جائزہ لے رہی

تھی...اور ایان کو دل ہی دل میں سراہ رہی تھی...کس قدر لاجواب شخصیت کا مالک ہے... یہ مجھ سے کتنی مطابقت رکھتا ہے...ایک شہاب ہے جو اتنا خشک مزاج ہے۔ دوسروں کا نازک دل روند دیتا ہے۔

ایک جگہ گاڑی کھڑی کر کے وہ پھولوں کے بھرے درختوں سے گزرتے ہوئے ایک بینچ پر بیٹھ گئے...ایان سرخ اور سفید گلاب کے پھول توڑ کر سحر کے قریب لاتے ہوئے بولا۔

ان کی خوشبو سے سارا گھر مہک جائے گا۔

سحر کے دل میں...ایک خاص جگہ بنتی گئی...سوچنے لگی کہ یہ بھی تو ڈاکٹر ہے۔

پھولوں کو سونگھا تو اس میں دلفریب خوشبو اٹھ رہی تھی اور پھول جب گھر میں لا کر پھول دان میں لگائے تو خوشبو سے واقعی سارا گھر معطر رہا۔

پھر ایک روز وہ ماں کو ملنے کے لیے گیا تو سحر اس کی کمی سے اداسی محسوس کرنے لگی...بے اختیار فون کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم آئے نہیں''

''بس...میڈم آ کر بتاؤں گا ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے...بہت پریشان ہوں''۔

''ٹھیک ہے''

سحر اس کی اس بات سے پریشان ہو گئی تھی۔ فون پر پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ صبح ناشتہ کی میز پر پھولوں کا گلدستہ رکھا ہوا تھا...اور ایان میز کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھا تھا...سحر کمرے میں داخل ہوئی تو پوچھا۔

یہ پھول کون لایا ہے؟

میں لایا ہوں...وہ تھوڑا سا غمگین لگ رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے''

میڈم...چھوڑیں... روز اس طرح کے حالات سے گزرتا ہوں...آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔

''سحر...بے چین ہو گئی...بتاؤ تو سہی''

میرے فلیٹ کی آخری قسط رہ گئی تھی۔ مالکان تنگ کر رہے تھے کہ فوراً ادا کرو۔

''کیا''

سحر نے ایک دم سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

یہ نئی بات نہیں ہے...کچھ نہ کچھ دے کر اس کا فی الحال منہ بند کر دیا ہے۔

اور کہا ہے کہ باقی رقم بھی جلد دے دوں گا۔

معاملہ ٹل گیا ہے۔

''سحر خیالوں میں کھو گئی''۔

میڈم پلیز دکھی نہ ہوں...مسئلہ حل کر دیا ہے۔

''کیسے''

وہ امی نے میری دلہن کے لیے جو زیور بنایا تھا۔ اس میں سے ایک سیٹ نکال کر دے دیا ہے۔

اس نے سحر کی جانب دیکھا تو دکھی ہو رہی تھی۔

''میڈم''

''کہو''

آپ کی نئی نئی شادی ہوئی ہے شہاب صاحب کو اس وقت آپ کے پاس ہونا چاہیے تھا...ایک کام کے لیے وہ اتنی محنت کرتے ہیں۔ جب ہو جاتا ہے تو دوسرا کام کرنے لگتے ہیں...جب سے میں نے ان کے ساتھ

کام کیا ہے ان کو بے حد مصروف پایا ہے۔
سحر کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے...اور ایان سے کہنے لگی...ایک بار ہی فلیٹ کے سارے پیسے ادا کردو۔
میڈم...وہ اداسی سے کہنے لگا...لاکھوں روپے کی آخری قسط ہے...اتنا اثاثہ تو نہیں ہے میرے پاس۔
پھر سحر نے دل میں سوچا...اس کی شخصیت میں نکھار ہے...ہر وقت تروتازہ پھولوں کا گلدستہ لاتا ہے...کاش یہ پہلے مل جاتا تو اس سے شادی کرلیتی...زندگی کتنی حسین ہو جاتی ہے۔ جلد بازی میں ایک بے حس انسان سے شادی کر بیٹھی...اچھی زندگی گزارنے کا میرا بنیادی حق ہے۔
''کیا سوچ رہی ہیں میڈم...اگر برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں''۔
''کہو''
''آپ بہت خوبصورت ہیں...شہاب صاحب بہت خوش قسمت ہیں۔ میں نے جب پہلی مرتبہ دیکھا تو...یقین جانیں''۔
وہ آگے خاموش ہوگیا---؟
کہو ایان...کہہ سکتے ہو میں برا نہیں مانوں گی۔
وہ جی...سب دوستوں کی بیویوں سے آپ بہت حسین ہیں...مگر شہاب صاحب۔
وہ آگے خاموش ہوگیا۔
سحر نے دل ہی دل میں کہا۔
کاش...تم میرے لائف پارٹنر ہوتے...اس وقت وہ شہاب کو بھول گئی...اندر سے چیک بک لاکر بھاری رقم کا چیک اس کے حوالے کیا...اور کہا۔
تم اپنے فلیٹ کی آخری قسط ادا کرو...مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا ہے تم نے...اس وقت میں بہت پریشان تھی۔
''چیک دیکھ کر اس نے کہا...نہیں...نہیں...میں ہرگز نہیں لوں گا...میں آپ کی دلجوئی کرنے آیا تھا روپے لینے تھوڑی''۔
''میں اپنی خوشی سے دے رہی ہوں''...جھجکتے ہوئے ایان نے روپے لے لئے اور کہا...کل شاید شہاب صاحب آجائیں ان کا کام ختم ہوگیا ہے۔
''میڈم...میں ہمیشہ یاد رکھوں گا''۔
سحر نے اس کی جانب دیکھا اور سوچا...وہ شہاب سے خلع لے کر ایان سے شادی کر لے گی۔ اس سے بہتر لائف پارٹنر نہیں ملے گا۔ وہ ایک دم سے پوچھنے لگی۔
''ایان...اگر میں تمہارے لئے کوئی لڑکی پسند کروں تو اس سے شادی کرلوگے''۔
''مگر ایک شرط ہے''
''وہ کیا''
''لڑکی آپ جیسی ہونی چاہیے''...سحر نے محبت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا...تو اس کی آنکھوں کی تپش بتا رہی تھی وہ اسے پسند کرتا ہے...اور سحر چند لمحوں کے لیے جذباتی ہوگئی...ایک قسم کا اسے جواب مل گیا کہ وہ بھی اسے چاہتا ہے۔ شہاب

کام ختم کرکے...شام کو اپنے گھر پہنچ گیا۔
سحر نے بجھے سے دل سے اس کا خیر مقدم کیا..شہاب والہانہ طور پر اس کو گلے سے لگاتے ہوئے کہنے لگا۔
یقین جانو..سحر ہر وقت تمہارا خیال دامن گیر رہتا تھا...اور بار بار دھیان تمہاری طرف لگا رہتا تھا...اور سوچتا تھا اس خوبصورت گھر میں صرف تمہیں نہیں بلکہ مجھے بھی ساتھ رہنا چاہیے تھا...چلو..تمہاری تنہائی دیکھ کر میں نے ایان کو بھیج دیا تھا..اسے بتایا تھا کہ تمہیں ہر جگہ کی سیر کروائے اور روزانہ میری طرف سے پھولوں کا گلدستہ تمہیں پیش کرے...تمہیں منظر کشی کا بہت شوق ہے...شکر ہے میرا کام ختم ہوا ہے...اس کی صبح فلائٹ ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر کے ملک جارہا ہے۔ کئی سالوں سے ایک لڑکی کے چکر میں پڑا تھا...وہ امریکہ میں رہتی ہے اس نے sponsor کیا ہے..اس سے شادی کر کے گرین کارڈ بھی حاصل کرلے گا...اور اس سے آگے سحر کچھ نہ سن سکی۔
تمہاری خدمت کرنے کے عوض کافی رقم دی ہے...اس کے فلیٹ کی قسطیں بھی ادا کر کے تمہارے پاس بھیج دیا تھا۔
سحر ایک دم سے چونکی...جیسے کسی بچھو نے اسے کاٹ لیا ہو...اس کا دل دھڑک اٹھا...اس کا فلیٹ کا مسئلہ تھا اور شہاب سے وہ پیسے لے چکا تھا سحر کا سر گھوم گیا......اور؟
اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ ماتھے پر اَن گنت ننھے ننھے پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔
وہ شہاب کے ساتھ باغ میں بیٹھی تھی۔
شام کے وقت ستارے مختلف دکھائی دے رہے تھے۔ آسمان کا گہرا نیلا رنگ دیکھ کر اس کے سینے میں درد کی لہر اٹھی... وہ بے اختیار گوشہ عافیت سمجھ کر کرسی سے اٹھ کر شہاب کے گلے لگ گئی۔
تو کیا آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔
"بہت...سچی محبت کرتا ہوں"...جو لازوال ہے۔
مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے...میں نے بے لوث محبت محسوس کی ہے۔
اپنا کام ادھورا چھوڑ کر شادی کی تھی...مگر...اب میں فارغ ہوں اور...میں تمہیں شادی ہوتے ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا اس کی معذرت چاہتا ہوں...مگر مجھے یقین تھا ایان تمہارا خیال رکھے گا...اب جو کام کرنے کے لیے بھی جاؤں گا...تم میرے ساتھ ہوگی۔ بہت کمی محسوس کی ہے...تمہارے بغیر میری زندگی ادھوری ہے۔
سحر دھڑکتے دل کے ساتھ شہاب کی باتیں سن رہی تھی...اور ایان...اس کے بارے میں آگے نہ سوچ سکی اور شہاب کی بانہوں میں سما گئی۔ شفق کے سارے رنگوں کی دھنک اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اس کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ سچی محبت کیا ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

اکیلا

گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ ہر طرف مسافروں کی گہما گہمی تھی۔ انجن کے دھوئیں اور بھاپ نے مل جل کر ایک سیاہ بادل کی صورت اختیار کر لی تھی، جس کے پیچھے سُرخ رُو آفتاب ڈھل چکا تھا۔ پل پر مسافروں کے آگے آگے قلی سامان اُٹھائے بھاگ رہے تھے۔ فرسٹ کلاس کے اپر برتھ پر رفعت کا بستر بچھا تھا۔ وہ چھٹیوں کے ختم ہونے پر واپس یونیورسٹی جا رہی تھی اور وہ موتی گھاٹ سے نشان پور جنکشن تک اسے چھوڑنے آیا تھا۔ ان دونوں نے برانچ لائن کی ایک سُست رفتار گاڑی میں سارا دن سفر کیا تھا۔

اگرچہ رفعت کے ساتھ اس کا تعارف اڑھائی ماہ قبل ہوا تھا جب وہ گرما کی چھٹیاں بسر کرنے اپنے ماموں کے ہاں آئی تھی لیکن اس کم عرصے میں بھی وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ شام کو وہ اکثر سیر کے لیے اکٹھے جایا کرتے تھے۔ راستے میں دنیا کے تقریباً ہر موضوع پر تبادلۂ خیالات ہوتا لیکن کبھی کبھی ویران سڑکوں پر چاندنی راتوں میں وہ کہیں دور چلا جاتا، کہیں کھو جاتا۔ ماضی کی یادیں اس کے خیالات کو اپنے ہمراہ لے جاتیں اور مستقبل کی بے یقینی اسے اور بھی اداس کر دیتی۔ رفعت اس لمحے آہستہ سے کہتی ''بھئی واپس لوٹ آیئے۔'' مانا کہ روشن چاند سے نورانی کرنوں کی پھوہار گر رہی ہے اور فضا بڑی رومانٹک ہو گئی ہے۔ لیکن اتنا بھی دور نہیں نکل جانا چاہیے کہ واپسی کا راستہ تک نہ یاد رہے۔''

اور اس کی آنکھوں میں چاندنی راتوں کے وہ تمام مناظر گھوم جاتے جو روشن کے ہمراہ اس نے دیکھے تھے۔ سمندر کے متلاطم پانی میں رات کی سیاہی گھل جاتی اور چاندنی میں لہروں پر چمکیلے سفید نشان ابھرنے اور مٹنے لگتے۔ نم آلود ہوا سے روشن کی معطر زلفیں بکھر جاتیں، اس کی آنکھوں میں نشہ سا بھر جاتا، اس کی ساڑھی کا پلّو سرک کر ہوا میں لہرانے لگتا اور وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ لیے خاموشی سے ریت پر چلتے جاتے۔

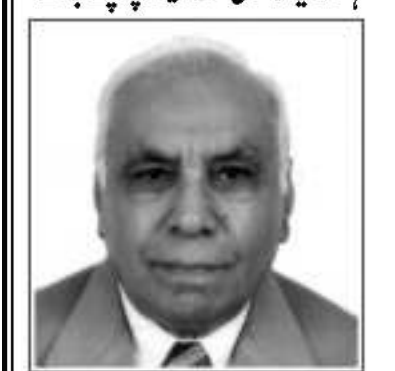

پیروز بخت قاضی

دور ساحل سمندر پر عالیشان ہوٹل کی کئی منزلہ عمارت نظر آتی، جس کی روشنیاں سمندر کی منعکس ہوتیں اور ارتعاش سے عجیب سماں پیدا کرتیں جیسے وہ کسی خوابوں کی نگری کا محل ہو.....

رفعت اسے ساحل سمندر سے اُٹھا کر پھر موتی گھاٹ کی ایک ویران اور اداس سڑک پر لے آتی جس کے دونوں جانب کھیتوں میں اگی فصلوں میں ہوا سرسراہٹ پیدا کرتی گزر جاتی اور جہاں ہر سمت چاندنی کا سحر مسلط ہوتا۔ اس نے کئی بار چاہا کہ وہ رفعت کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لے لیکن وہ کبھی اپنی خواہش کی تکمیل نہ کر سکا۔ اسے رفعت کو چھوتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ اسے رفعت کا جسم گوشت پوست کے بجائے باریک شیشے سے بنا معلوم ہوتا تھا۔ اسے خطرہ محسوس ہوتا کہ ہاتھ لگانے سے کہیں وہ چھوئی موئی کی طرح مرجھا نہ جائے، چھونے سے کہیں پانی کا نازک بلبلہ ٹوٹ نہ جائے۔ کبھی کبھی وہ محسوس کرتا کہ رفعت ایک بہت بلند مقام پر کھڑی ہے جہاں تک اس کی رسائی ممکن نہیں۔ رفعت جب اپنے پروفیسروں یا ہم جماعتوں کا ذکر کرتی یا جب وہ موتی گھاٹ کی پُرسکون اور خاموش فضاؤں کی تعریف کرتی تو وہ اسے اپنے قریب محسوس کرتا لیکن جب وہ سائنسی تحقیقات، فلسفیانہ خیالات اور عظیم مفکرین کے نظریات پر تبصرے کرتی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہو۔

جب رفعت اس سے رخصت ہو رہی تھی تو وہ سوچنے لگا کہ چند لمحوں کے بعد گاڑی سیٹی بجائے گی اور روانہ ہو جائے گی اور پھر پلیٹ فارم کی تمام گہما گہمی ماند پڑ جائے گی۔ مسافر کہیں غائب ہو جائیں گے۔ سٹال بند ہو جائیں گے۔ کسی پھیری والے کی آواز نہیں آئے گی۔ بل اپنی دونوں ٹانگوں پر کسی آہنی دیو کی مانند خاموش کھڑا رہے گا۔ ڈوبتے سورج کی سرخ اور نارنجی کرنیں سیاہی میں بدل جائیں گی۔ پلیٹ فارم پر بجلی کے قمقمے روشن کر دیے جائیں گے جن کے گرد پروانوں کے جھنگٹے منڈلانے لگیں گے۔ ویران ٹی سٹال کے کونے سے کسی خارش زدہ کتے کے کراہنے کی آوازیں آئیں گی۔ ہر طرف ایک گہری خاموشی، ایک مکمل سکوت، ایک عمیق اداسی ہوگی۔

رفعت کی روانگی کے بعد اس نے بازار جا کر کچھ چیزیں خریدنا تھیں اور پھر رات پونے بارہ بجے کی گاڑی سے موتی گھاٹ واپس جانا تھا گاڑی نے حرکت کی اور آہستہ آہستہ پلیٹ فارم خالی ہو گیا۔ لیکن وہ بڑی دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ وہ اتنا تھک چکا تھا کہ سٹیشن سے باہر جانے کے بجائے ویٹنگ روم میں آ کر ایک کرسی پر لیٹ گیا۔ اس کے چہرے پر تھکن مایوسی اور غم کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی آنکھیں شدید جلن سے بند ہونے لگیں۔

آج سے دو برس قبل ایک ایسی ہی شام تھی جب وہ روشن سے رخصت ہوا تھا۔ وہ سٹیشن تک اس کے ہمراہ آئی تھی۔ وہ کس طرح چہک چہک کر باتیں کر رہی تھی اور درمیان میں اپنے مخصوص انداز سے مسکراتی جاتی تھی۔ جب وہ مسکراتی تو اس کے گالوں کے نیچے ننھے گڑھے پڑ جاتے۔ اسے کتنے بھلے لگتے تھے یہ گڑھے۔ اسی لیے تو وہ روشن کو مس ڈمپل کہا کرتا تھا۔ وہ دونوں ٹیکسی سے اُتر کر قلی کے پیچھے پیچھے اپنے کمپارٹمنٹ میں پہنچے تھے۔ روشن نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اس کے ہمراہ تھوڑا سا سفر کرے گی۔ اگرچہ وہ اسے سفر کی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ اگلے سٹیشن پر اس نے روشن سے کہا تھا کہ وہ واپس چلی جائے مگر اس نے اور آگے جانے کی ضد کی تھی اور اس کے بازو کو اپنے ہاتھ سے پکڑ لیا تھا۔ اس طرح وہ قادر آباد کے سٹیشن تک اس کے ہم سفر رہی تھی۔ روشن نے وہی گلابی ٹیشو کی ساڑھی اور بلائز و پہن رکھے تھے جو اس نے روشن کو اس کی سالگرہ پر تحفے میں دیئے تھے۔ روشن نے اپنے بال بھی اسی اُبھرے اُبھرے انداز میں بنائے تھے جو اسے بہت پسند تھا۔ اور جب ہوا سے وہ کچھ بکھر جاتے تو روشن کی صورت اور بھی حسین ہو جاتی قادر آباد کے سٹیشن پر روشن کی فرمائش پر دونوں نے جوس پیا تھا۔ وہ اب تک اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے مسکرا رہی تھی۔ حالانکہ خود اسے روشن سے جدا ہونے کا دکھ تھا لیکن روشن کی مسکراہٹوں کو دیکھ کر وہ اپنی اداسی کو کہیں اندر ہی اندر دبائے جا رہا تھا۔ جب گاڑی چلنے لگی اور روشن نے اپنا نازک ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو وہ اپنے اشکوں کے سیلاب کو نہ روک سکی جس کے آگے وہ اب تک مسکراہٹوں کا بند تعمیر کرتی رہی تھی۔ اس کی بادام جیسی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور دو قطرے اس کے گلابی اور ملائم رخساروں پر یوں پھسل گئے جیسے شبنم کے موتی پھول کی پتیوں پر سے ڈھلک جاتے ہیں۔ وہ پلیٹ فارم پر کھڑی ایک ہاتھ سے رومال ہلا رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے آنسو پونچھ رہی تھی اور گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جاتی تھی۔ وہ اس وقت تک دروازے میں کھڑا رہا جب تک روشن کی صورت ایک نکتہ بن کر اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی۔

آج اس نے رفعت کو رخصت کیا تھا جس سے تعارف ہوئے صرف اڑھائی ماہ گزرے تھے لیکن جس کی گاڑی جانے کے بعد وہ لٹا لٹا محسوس کر رہا تھا جیسے اس کی زندگی موتی گھاٹ کے قصبے کی طرح ویران اور اداس ہو، جیسے امید بہار کے ساتھ ہی خزاں آ جائے، جیسے اس کی زندگی کا مقصد کھو گیا ہو، جیسے وہ دنیا بھر میں اکیلا رہ گیا ہو۔

☆☆☆☆☆

خواب لے لو خواب

سارے وسوسے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے تھے۔دل میں جو خدشات سَر سَراتے پھر رہے تھے وہ بھی کہیں جاڈبکے تھے۔پورے رستے اُنہوں نے کوئی چھچھوری حرکت نہیں کی تھی۔اب تو ہم اس سب سے بڑے Conecting Point پہ آپہنچے تھے جہاں دنیا بھر کے بَحری اور بَرّی جہاز---- مشرق اور مغرب کو ملانے کے لیے پڑاوٗ ڈالتے ہیں۔

میرے چاروں طرف تیز روشنیاں تھیں اور ان کی چکاچوند آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ زندگی اِتنی چمکدار بھی ہوتی ہے؟ مجھے خبر ہی نہ تھی۔

ایئرپورٹ سے باہر نکلے تو بڑی سی گاڑی سُبک خرامی سے ہمیں لے کر دودھیا روشنی میں نہائی ہوئی صاف شفاف سڑکوں پر دوڑنے لگی اور میں اس چُم چَم کرتی لمبی سے گاڑی کی آرام دہ سیٹ پہ بیٹھی اُچک اُچک کے اِن مصنوعی اُجالوں کو اپنی آنکھوں میں سمیٹنے لگی۔

کچھ ہی دیر بعد گاڑی ایک بلند و بالا روشنیوں میں نہائے ہوئے ہوٹل کے سامنے جارُکی

"رما دا ہوٹل"

میں حیرت زدہ سی اس ہوٹل کی بلند و بالا عمارت کو دیکھ رہی تھی کہ اُنہوں نے میری محویت کو توڑا۔

اِس ہوٹل میں آپ کے ٹھہرنے کا بندوبست کیا ہے شفق بی بی! اس میں پانچ ریسٹورنٹ ہیں - اس ہوٹل کے سب سے بڑے ریسٹورنٹ Tamarind میں---- جوائنٹ نیشنل کیسو ہے اور انڈین کھانوں کا ریسٹورنٹ بھی ہے۔

وہ بولے!

میں نے سوچا---- ابھی آپ عربی اور انگلش کھانوں کے ذائقوں سے ناآشنا ہیں اس لیے آپ کے لیے یہی ریسٹورنٹ مناسب رہے گا۔

تسنیم کوثر

میں نے دھیمی سی مسکراہٹ سے انہیں تشکر بھری نظروں سے دیکھا۔وہ سچ ہی کہہ رہے تھے۔عربی اور انگلش کھانے تو دور کی بات میں تو کسی پاکستانی ہوٹل میں بھی نہیں گئی تھی۔وہ تو قسمت اچانک ہی ایک مزدور کی بیٹی اور ایک نکھٹو کی بیوی پر مہربان ہوگئی تھی۔

کہاں گاؤں کی چھوٹی چھوٹی پیچیدہ سی گلیاں جہاں سیوریج کا گندا پانی کبھی خشک ہی نہ ہوتا تھا اور اسی گندگی میں گھرا میرا سیلن زدہ گھر۔اور کہاں یہ شاندار ہوٹل؟

میں ابھی تک بے یقینی کی کشتی میں ہچکولے کھا رہی تھی۔

میں غُربت کی گود میں بڑی ہوئی تھی۔بس سفید پوشی کا بھرم رکھا ہوا تھا۔صبر کی بُکل مارے۔۔۔خواہشوں کو دِل میں دبائے۔۔۔ اپنے خوابوں کو اپنے آپ سے چُھپائے اور زمانے کی بے رحم نگاہوں سے خود کو بچائے میں اس حبس زدہ ماحول میں محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھی اور خود بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھی۔ایف اے کیے مجھے دو سال ہوگئے تھے میں تو اب بی۔اے کی تیاری میں تھی مگر ابے کو میری شادی کر کے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کی فکر پڑ گئی تھی۔

”ہم لڑکیاں تو۔۔۔اس نئی صدی میں بھی۔۔۔ بوجھ ہی سمجھی جاتی ہیں“۔

میں غُربت کی جھولی سے نکلی اور غُربت کی جھولی میں ڈال دی گئی۔ابے نے سکھ کا سانس لیا۔اس کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

میری ساس بیوہ تھی وُہ سکول میں آیا گیری کرتی تھی اور اس کا اکلوتا جوان بیٹا علی گھر میں پڑا اینڈتا رہتا تھا۔جس کے پاس تعلیم تھی نہ پیسہ مگر۔۔۔۔اُس کے خواب بہت اونچے تھے۔وہ گھنٹوں میرے ساتھ آگے بڑھنے کے منصوبے بناتا رہتا۔مگر عمل درآمد نہ کر پاتا۔ہماری اس پلاننگ میں وقت گزرتا رہا اور پھر ہادی میری گود میں آ گیا۔اب ہمارے خرچے بڑھنے لگے تھے۔وہ روز نوکری کی تلاش میں نکل جاتا مگر ناکام واپس آتا۔مزدوری وہ کرنا نہیں چاہتا تھا اور افسری اسے مل نہیں سکتی تھی۔

اُس کی ناکامی دیکھ کر میں نے اخباروں میں اشتہار دیکھنا شروع کر دیے۔مگر جہاں جاتی۔۔۔۔وہاں غیر شادی شدہ لڑکی کی مانگ کی جاتی تھی یا پھر اعلیٰ تعلیم یافتہ کی جبکہ میں تو ایک بچے کی ماں تھی اور میری تعلیم بھی واجبی سی تھی اس لئے نوکری ملنا مشکل ہو رہا تھا۔

ایک دن بس ہوسٹس کا اشتہار دیکھ کے میں نے علی کو اپنے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔ اگلے روز میں انٹرویو دینے جا پہنچی۔خود کو غیر شادی شدہ ظاہر کیا۔میری اچھی شکل وصورت دیکھتے ہوئے مجھے یہ نوکری دے دی گئی۔اب علی ہادی کو سنبھالتا تھا اور میں نوکری کر کے گھر کو سنبھالنے لگی تھی۔گھر کی گھٹن سے نکلی تو باہر کی فضا نے میرا رنگ

رُوپ کچھ اور نکھار دیا -اب ہمارے حالات آسودگی کی طرف بڑھنے لگے تھے کہ اچانک اک نیا موڑ سامنے آگیا۔

میری ساسو ماں کے سکول میں اک تقریب تھی۔ اس روز وہ ہمیں بھی ساتھ لے گئی تھی۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ یہاں موجود تھے۔ شاعر، ادیب، گلوکار، فنکار۔ میں ان سب کو بڑی محویت سے دیکھ رہی تھی کہ اچانک میری نظر مشہور ڈرامہ سیریل کی ایک سائیڈ ہیروئن پہ جا پڑی۔۔۔ وہ میرے دائیں جانب بیٹھی تھی۔ بس میں نے اس سے راہ ورسم بڑھانے کو اُس کی اداکاری کی تعریف کر دی اور باتوں باتوں میں اس سے ٹی وی ڈرامے میں کام کرنے کا طریقہ بھی پوچھ ڈالا۔

کیا آپ لوگ کام کرنا چاہتے ہو؟ اس نے اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے پوچھا۔

میم۔۔۔ جی تو چاہتا ہے مگر۔۔۔ ہمیں کوئی جانتا ہی نہیں تو کام کیسے کریں گے؟ میں نے کہا۔

اُس نے میرے گال تھپتھپائے اور بڑے شیریں لہجے میں کہا۔ اس نمبر پہ فون کرنا اور وقت طے کر کے ان سے ملنے چلے جانا اس نے ایک کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔

فنکشن کیسا رہا؟ مجھے خبر نہ تھی۔

اس شام میں گھر لوٹی تو۔۔۔ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ مستقبل کے تانے بانے بنتے ہی میں نے رات گزار دی تھی۔ صبح ناشتے کے بعد فون ملایا۔

مگر۔۔۔ جواب ندارد۔

مسلسل فون ملاتے رہنے پر بھی "جواب موصول نہیں ہو رہا" کی آواز نے میرا دل بٹھا دیا۔

اُمید وبیم کی کیفیت طاری ہوگئی۔

آدھا دن گزر گیا میں اپنی ڈیوٹی پہ بھی نہیں گئی تھی اور یہاں بھی بات نہیں بنی تھی۔ میں مایوس ہو کے گھر کے کام نمٹانے لگی کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ میرا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ سکرین پر وہی نمبر تھا۔ جسے میں کئی بار ڈائل کر چکی تھی۔

میں نے لپک کر فون اٹھایا۔

"جی؟" ایک گھمبیر آواز نے میری بولتی بند کر دی۔

"جی! وہ جی کل شبانہ جی ہمیں ملی تھیں جی۔ انہوں نے آپ کا نمبر دیا مگر۔۔۔۔ انہوں نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

جی کل دو بجے آپ تشریف لے آئیں۔ انہوں نے مجھے ایڈریس سمجھایا اور فون بند ہوگیا۔

میری آنکھوں میں رنگین سپنے لہرانے لگے۔ خدا گواہ ہے یہ رات بھی میں نے جاگتے ہوئے ہی گزار دی تھی۔

زندگی میں پہلی بار مجھے وقت کی اہمیت کا

اندازہ ہوا تھا۔
دل میں ولولے لیے ---- آنکھوں میں خواب بھرے ہم وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ جہاں ''فن اکیڈمی'' کا بڑا سا بورڈ لگا تھا۔
فن اکیڈمی میں خاصی چہل پہل تھی۔ میں ہر ایک کو اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بہت سے فیشنی لڑکے لڑکیاں آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ سب اِرد گرد سے بے نیاز ---- اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے۔
زندگی یہاں بہت تیز رفتار لگ رہی تھی۔
کچھ ہی دیر کے بعد ہمیں اندر بلا لیا گیا۔ جدید طرز کے آراستہ کمرے میں شاندار سی کرسی پر ایک ادھیڑ عمر کے باوقار سے صاحب ہمارے سامنے تھے۔
جی وہ مختار صاحب---- میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بھاری بھرکم آواز گونجی۔
بیٹھیے ----
انہوں نے گہری نظروں سے ہمارا جائزہ لیتے ہوئے قدرے توقف سے پوچھا۔ آپ دونوں میں سے کام کون کرنا چاہتا ہے؟
اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی۔ علی بول اُٹھا۔ ہم دونوں جی!
انہوں نے ہمیں سر سے پاؤں تک ٹٹولتے ہوئے سوال کیا۔
''شوق ہے یا ضرورت؟''
جی دونوں ہی! اب کے بولنے کی باری میری تھی۔
کیونکہ خالی جیب کتنی بھاری ہوتی ہے یہ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔
اتنے میں چائے آ گئی تھی۔ چائے کے دوران مختار صاحب ہمیں گُرید تے رہے۔ گھر کے حالات ---- ہمارے خیالات جاننے کے بعد ---- اُنہوں نے بہت دھیمے لہجے میں ہمیں اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔
یہ فن اکیڈمی آپ جیسے شوق رکھنے والوں کے لئے ہی بنائی گئی ہے۔ کام سے لگن ہو تو اپنے شوق کے مطابق جگہ بنائی جا سکتی ہے۔ مجھے تم دونوں میں وہ چیز نظر آ رہی ہے جو تمہیں بہت آگے تک لے جائے گی۔ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔ میری سیکرٹری تمہیں سب سمجھا دے گی۔
مس روبی نے ہمیں اس اکیڈمی کے بارے میں سب سمجھا دیا تھا۔ تمام قانون قاعدے بتا دیے تھے اور ---- ہمارے شوق کے مطابق ڈیپارٹمنٹ چُن کے ہمیں کل آنے کا کہہ دیا تھا۔
فن اکیڈمی سے باہر نکل کے ---- میں اور علی کتنی ہی دیر اس عمارت کو تکتے رہے تھے جس کے گھنے اور سایہ دار درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں نے ہمیں سمیٹ لیا تھا۔ زندگی سنور جانے اور سنہرے مستقبل کی آس نے مجھے

نم دیدہ کر دیا تھا۔
ہمیں اکیڈمی جوائن کیے ہوئے دو ماہ ہو گئے تھے۔ مختار صاحب ہماری دلچسپی اور لگن سے بہت خوش تھے۔ ہم وقت کی پابندی کرتے --- اپنا کام محنت اور لگن سے کرتے۔ علی کو میک اپ آرٹسٹ کی ٹریننگ دی جا رہی تھی اور مجھے --- ماڈلنگ کے شوق نے یہ شعبہ چننے پہ مجبور کیا تھا۔ مس تاباں ہمیں گفتگو کرنے، پہننے اوڑھنے کے بارے میں ٹریننگ دے رہی تھیں۔ صبح آتے ہی ہمارا ایک گھنٹہ ادب آداب سیکھنے میں گزر جاتا تھا۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ ہم دونوں ایک ہی جگہ، ایک ہی شہر میں ایک ہی چھت کے نیچے کام کر رہے تھے اور زندگی جینے کا سلیقہ سیکھ رہے تھے کہ اچانک ---- ایک روز مختار صاحب نے مجھے بلا بھیجا۔
الٰہی خیر!
کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی مجھ سے۔
میں ڈرتے ڈرتے ان کے آفس پہنچی۔ تھوک نگلتے ہوئے بمشکل جی کہا۔
انہوں نے بیٹھنے کا اشارا کرتے ہوئے کہا۔
ثمن بی بی! ایک پروڈکٹ کی ریکارڈنگ کے لیے ہماری ٹیم بیرون ملک جا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ساتھ چلو۔ کچھ باہر کی دنیا دیکھو۔ کچھ اپنے بارے میں سوچو۔ کیا خیال ہے تمہارا؟ جانا چاہو گی؟
میں سکتے میں آ گئی تھی۔
ابھی دو ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ قسمت نے زور آوری کر دی تھی۔ مگر --- میں تذبذب میں تھی۔
وہ مختار صاحب میرے پاس تو ڈھنگ کے کپڑے ہیں نہ پیسے کہ --- نئے خرید لوں۔
میں نے ہکلاتے ہوئے بات مکمل کی۔
بی بی! مس تاباں آپ کو کل شاپنگ کے لیے لے جائیں گی۔ مختار صاحب بولے۔
میں اس روز ہوا میں تیرتی ہوئی گھر لوٹی تھی۔ سارے رستے میں اور علی پلاننگ کرتے رہے تھے۔ میں ہادی کی وجہ سے تھوڑا فکر مند تھی مگر --- علی نے مجھے مطمئن کر دیا تھا۔ گھر سے دُور، ملک سے دُور جانے کا خوف دل میں کہیں تھا مگر --- میں نے اسے سر اُٹھانے ہی نہیں دیا تھا۔
اگلے روز مس تاباں مجھے مال آف لاہور لے گئیں اور بہت عالیشان ڈریسز دلوا دیئے۔ میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ہائے میں یہ پہن کے ریما اور ریشم جیسی لگوں گی۔
دل میں لڈو پھوٹنے لگے تھے۔
میں عجب سرشاری میں تھی۔
علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے "رمادہ ہوٹل" تک کا سفر میں نے خواب بنتے ہوئے کیا تھا۔ میں ماضی، حال اور مستقبل کی تکون میں اُلجھی ہوئی تھی۔ ماضی کی ہولناکیاں مجھے ہولا رہی تھیں۔ حال کی رنگینی مجھے مست

کیے ہوئے تھی اور مستقبل کے سنہرے سپنے مجھے بے چین کر رہے تھے۔
اگلے دن ہم بام جمیرہ جا پہنچے تھے۔
بام جمیرہ سمندر میں مٹی ڈال کے بنایا گیا ہے۔ جہاز سے تو یہ بالکل کھجور کے درخت جیسا لگا تھا یہاں اٹلانٹس ہوٹل میں مجھے ٹھہرایا گیا جو بام جمیرہ کے لگژری ہوٹلز میں سے تھا۔
مختار صاحب مجھے یہ سب بتا رہے تھے۔
استقبالیہ سے لے کر روم سروس تک عمدہ --- کشادہ سوئمنگ پول، دلکش رنگ برنگی مچھلیوں سے بھرے ایکوریم --- واٹر پارک اور موتو ویل تک رسائی فرنٹ اور بیک سے سمندر کا حسین نظارہ جنت کا سماں پیدا کر رہا تھا۔
اسی جمیرہ کے ساحل پر دنیا کا تیسرا بلند ہوٹل برج العرب بھی شان سے سر اٹھائے کھڑا تھا جسے دیکھ کے میری آنکھوں میں حیرانی اتر آئی تھی اور میری اس حیرانی کو بھانپتے ہوئے وہ مجھے برج العرب دکھانے لے آئے تھے۔ جس میں داخلے کا ٹکٹ چار سو درہم یعنی پاکستانی بارہ ہزار روپے تھا۔
اُف اتنے زیادہ پیسے۔
میں نے دانتوں میں انگلی داب لی تھی۔
مجھے تو بس ہوسٹس کی اتنی تنخواہ ملتی تھی۔ پورا مہینہ اور بارہ ہزار۔ پیسے کی اس ریل پیل نے مجھے حیران سا کر دیا تھا۔
ہوٹل کے اندر کی فضا پر تعیش تھی اور ہوٹل کے باہر جمیرا ساحل کے دلفریب نظارے ---

مختار صاحب مجھے ٹریک پارک بھی دکھانے لے گئے جس میں اندر داخل ہوتے ہی دائیں طرف ہلکے نیلے رنگ کی عمارت میں ڈالفن شو کا اہتمام کیا تھا۔
یہاں ڈولفن کی شکل کا ایک چھوٹا سا چلڈرن پلے لینڈ دیکھ کے مجھے اپنا ہادی یاد آنے لگا۔ ممتا بے چین ہوئی پلکیں بھیگیں مگر میں نے یہ بھی مختار صاحب پہ ظاہر ہی نہ ہونے دی کہ اپنا مستقبل جو بنانا تھا مجھے۔
یہ تو پروگرام بنتے وقت ہی مجھے مختار صاحب نے کہہ دیا تھا۔ ثمن بی بی اگر گھریلو عورتوں کی طرح بات بات پہ روؤں گی تو سمجھ لو تم ترقی نہیں کر سکتیں۔
آگے جانا ہے، منزل کو پانا ہے تو پیچھے مڑ کے مت دیکھنا۔ ورنہ پتھر کی ہو جاؤ گی۔
پھر میں نے یہ عہد کر لیا تھا کوئی رشتہ، کوئی جذبہ مجھے پیچھے مڑ کے دیکھنے پر مجبور نہیں کرے گا۔
ہمارے پاس سیر و تفریح کے لیے بھی دو دن تھے۔ کمپنی کے مالک لندن گئے ہوئے تھے ۔ اب مختار صاحب مجھے سفاری ڈیزرٹ لے کر جا رہے تھے۔ لینڈ کروزر میں تین گھنٹوں کے پر خطر سفر کے بعد چاروں اور صحرا کے بیچوں بیچ آباد ہم ایک خوبصورت شہر میں آ گئے تھے۔
اس دیومالائی شہر نے صحرا کو روشنیوں کا منبع بنا دیا تھا۔

رات اترنے سے پہلے ہی پُرتکلف ڈنر کا اہتمام کیا گیا۔ بوفے ڈنر میں اتنے ڈھیر سارے کھانے دیکھ کے میں بوکھلا گئی تھی۔

میں کیا کھاؤں؟ کیا نہ کھاؤں؟

مجھے تذبذب میں دیکھ کے مختار صاحب نے مجھے سنبھالا دیا۔ چھری کانٹا پکڑنا سکھایا۔ کھانوں سے روشناس کرایا۔

کھانے کے بعد ہم کیمپ میں آ گئے۔ جس کے درمیان میں سٹیج بنایا گیا تھا اور اس کے چاروں طرف گاؤ تکیے لگا دیے گئے تھے۔ لوگ ان گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے سٹیج پہ نظریں جمائے ہوئے تھے جہاں--- ایک عرب لڑکی سی تھرو گاؤن پہنے عربی گانے پر تھرکتی مچلتی شوخ و چنچل اداؤں کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی۔ بے باکانہ انداز میں جب وہ تھرکتی تو دیکھنے والے نہال ہو جاتے۔

کیسا لگ رہا ہے ثمن بی بی! انجوائے کر رہی ہیں نا۔ مختار صاحب نے پوچھا۔

جی جی--- مختار صاحب۔ میں نے لجاجت سے جواب دیا۔ رات مجھے میرے ہوٹل اُتارتے ہوئے وہ کل کا پروگرام بتانے لگے۔

کل ذرا اچھا سا تیار ہو جایئے گا۔ شوخ سا ڈریس پہنیے گا۔

ہمیں کل Yas Island جانا ہے۔

یہ دبئی اور ابوظہبی کے درمیان خوبصورت ترین جزیرہ ہے۔ بہت مہنگا ہے بلکہ یوں کہیں بہت ہی مہنگا ہے۔ بہت ہی خوبصورت ہے جہاں آپ جیسے خوبصورت لوگ جائیں تو اور بھی خوبصورت ہو جاتے ہیں۔ جس پارٹی نے آپ کو یہاں بلوایا ہے وہ بھی کل وہیں ملے گی۔

میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی مگر سنہرے خوابوں نے خوف کی یہ دیوار گرا ڈالی۔

Yas Island کے فائیو سٹار ہوٹل کے کمرے کی لابی میں نور جہاں کے گانوں کا سحر تھا۔ جزیرے سے سمندر کی بپھری لہروں کے ٹکرانے کا مترنم شور تھا اور عربی شہزادوں، مقامی رئیس زادوں اور نو دولتیوں کی بہترین کروزکشتیوں کا نظارہ تھا جس نے مجھے مبہوت کر رکھا تھا۔ ہوٹل کے نائٹ کلب کے گانوں کی لابی تک آتی ہوئی دھمک دل--- پر چا رہی تھی اور ہر آدھ منٹ کے بعد دنیا کی کسی بہترین ایئر لائن کے جہاز کے شور کی آواز دل لبھا رہی تھی۔ دریائے کرک میں کروز ڈنر کا حسین نظارہ مجھے کسی طلسماتی دنیا میں لے آیا تھا۔ یہیں میں نے دنیا کی سب سے اونچی عمارت برج الخلیفہ دیکھی۔ ڈانسنگ فوارے--- شاندار مال کسی اور ہی دنیا کا سماں باندھے ہوئے تھے۔ کلب ڈسکو اور پب جی--- کبھی ٹی وی ڈراموں فلموں میں دیکھے تھے--- میں نے یہاں حقیقت میں دیکھ لیے تھے۔ یہاں تو شام ڈھلتے ہی زندگی رقص کناں ہو جاتی تھی۔ جذبے جاگنے لگتے تھے اور اب تو--- میرے نصیب بھی جاگنے

والے تھے کہ کچھ عرب شیخ اور کچھ نو دو لیتے آن پہنچے تھے۔

بہت سی آنکھیں مجھے ٹٹول رہی تھیں۔ مجھے جانچ رہی تھیں۔

میں ان آنکھوں کی چبھن محسوس کر رہی تھی مگر مختار صاحب کا ساتھ مجھے سنبھالے ہوئے تھا۔ مجھے ان سب کے درمیان ایک عالی شان کرسی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ عربی اور انگریزی میں بات چیت ہو رہی تھی۔ میرے پلے یہ گٹ پٹ نہیں پڑ رہی تھی۔ میں تو چہرے پڑھ رہی تھی۔ تیز آوازوں، تلخ لہجوں کی تکرار سے اندازہ لگا رہی تھی۔

اپنی طرف اُٹھنے والی للچائی ہوئی نظریں دیکھ رہی تھی اور دل میں کہیں کچھ اُتھل پتھل ہونے والے اِضطراب کو چھپا رہی تھی۔

بڑی بحث و تکرار کے بعد مختار صاحب اس بڑے شیخ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اب محفل برخاست ہونے کو تھی۔

مختار صاحب کنٹریکٹ کے کاغذات میرے سامنے رکھ کے میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

بہت مبارک ہو بی بی ابوظہبی کے سب سے بڑے شیخ کے ساتھ تمہارا کنٹریکٹ سائن کرایا ہے۔

وارے نیارے ہو جائیں گے تمہارے لو! اب سائن کرو۔ شاباش!

لمحہ بھر کو جیسے دل ڈوبا تھا اور املتاس کی سی زردی نے گالوں پر بسیرا کر لیا تھا مگر---

اگلے ہی لمحے میں نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن کے ان سے پوچھا تھا۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟

بی بی---اس معاہدے کی رو سے ہر مہینے کے دس دن تم سفاری ڈیزرٹ میں شیخ کی مہمان بنو گی۔ اس کا جی بہلاؤ گی۔ یہ نئی راہیں تمہیں تمہارے شوق کی منزل پر لے جائیں گی اور تمہارے خوابوں کی تکمیل کریں گی۔

میرے اندر کچھ ٹوٹنے لگا تھا۔ مگر میں خود کو سنبھالے رہی۔

میرے چہرے پہ پھیلے اِضطراب کو دیکھ کے مختار صاحب بولے تم اپنی زندگی بدلنا چاہتی تھیں نا شفق بی بی۔ سو میں نے تمہارا ساتھ دیا۔ تمہیں تمہاری پسند کے مطابق خواب بیچ دیا۔

مجھے دوش مت دینا بی بی---

میں نے تو تمہارے خوابوں کی تکمیل کی کوشش کی ہے۔ میں خوابوں کا سوداگر ہوں۔ ضرورتیں دیکھ کے خوابوں کی پٹاری کھول دیتا ہوں۔ میں رستے دکھاتا ہوں--- رستے بناتا ہوں--- غربت میں دم توڑتی تتلیوں کو مہکے ہوئے گلشن میں پہنچاتا ہوں۔

میں تو بس صدائیں لگاتا ہوں ن۔م۔ راشد کے اندھے کباڑی کی طرح کہ--- خواب لے لو خواب۔

☆☆☆☆☆

مطلبی.....!

ناسازگار گھریلو حالات کے باعث میں ہی نہیں چھوٹا بھائی عقیل بھی تعلیم ادھوری چھوڑ کر کام کاج میں لگ گئے۔ دراصل پیسہ دنیا کی سب سے خوشگوار حقیقت ضرور.....جس کی بہتات تسکین کی اوورڈوز .....اور..... کئی لحاظ سے آسمان کو چھو لینے کے ذائقے جیسا نشہ..... جبکہ.....کمی .....دوسروں کی تو بہت بعد میں، سب سے پہلے انسان کو اپنی ہی نظروں میں گرا دینے، نظریں اٹھا کر بات کرنے کی ہمت تک چھین لینے ہی نہیں بلکہ انسانیت کے پَر تک کتر دینے اور احتیاجات کے گھنے اور پر پیچ جنگل کے بیچ واقع کسی اندھے کنوئیں میں ایک ہی دھکے میں ضمیر کو پھینک کر ہمیشہ کے لیے خواہشات کے قبرستان میں بھٹکتے چلے جانے کا باعث..... ! اس تلخ حقیقت سے بارہا واسطہ پڑا تو ردعمل کوشش ہی تھا۔ وہی کسی فیکٹری میں ہیلپر یا پھر دکان وُکان میں ملازمت۔ اب یہ الگ بات کہ کم عمر نوجوان ہی سرمایہ دارانہ --- یعنی مکارانہ ذہنیت کے حامل شاطر افراد کا بہت عمدہ شکار --- با آسانی بن جاتے ہیں سو مجھے بھی بننا ہی تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ میں نے کسی نہ کسی طرح تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ عقیل کی دوستیاں گارمنٹس فیکٹریوں میں کام کرنے والے سپروائزرز یا ہیلپرز سے تھیں جبکہ میرے حلقۂ احباب میں زیادہ تر پڑھے لکھے یا قدرے دانا لوگ شامل تھے۔

یوں ہی ایک روز عقیل گھر موجود تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ باہر نکلا اور جب واپس آیا تو اس کے ساتھ چھوٹے سے قد، سانولی رنگت اور تقریباً اڈھیر عمری کی آخری حدود میں بڑھاپے سے چند قدم دور ایک شخص تھا۔ عقیل نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ یہ میرے بڑے بھائی شکیل ہیں۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ یہ نوید اقبال صاحب ہیں میرے ساتھ فیکٹری میں کام

شہزاد تصور

کرتے ہیں۔ ان کی رہائش اچھرہ میں ہے اور یہ میرے سینئر لیکن انتہائی مخلص دوست ہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور واش روم کے لیے کمرے سے نکل گیا۔ واپس آیا تو معلوم ہوا کہ ان صاحب کی فرمائش پر آج شام پانچ بجے ہی کھانا تیار ہو رہا ہے۔ نجانے کیوں مجھے کچھ دلچسپی محسوس ہوئی۔ اپنے آپ سے دوگنی عمر کے افراد کے ساتھ دوستیوں کے معاملے میں بہت وسیع الذہن تھا لیکن اس مرتبہ مجھ سے ایک سال چھوٹا ہونے کے باوجود عقیل بھی شاید میرے نقشِ قدم پر چل پڑا تھا۔ خیر نوید اقبال بہت پرتپاک اور گرمجوش تو تھا ہی لیکن مختلف فلسفوں کے بیان کے دوران کوئی بریک یا سپیڈ بریکر نہ ہونے کے باعث جلد ہی سمجھ گیا کہ سوچ سمجھ کر بات کرنا ہوگی ورنہ اگر ایک مرتبہ غلط بٹن پریس ہو گیا تو جان چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ یہ الگ بات کہ نجانے کیوں اس کی شخصیت میں خواہ مخواہ دلچسپی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ مجموعی طور پر معاشرے اور حالات کی چکی میں پسا ہوا تقریباً اینگری اڈھیر عمر آدمی تھا جس کے دل میں نجانے کتنے شکوے کب سے کلبلا رہے تھے جنہیں وہ آج میرے سامنے اگل دینے پر تل گیا تھا۔ باتوں کے دوران میں نے عقیل سے پوچھ لیا کہ نوید صاحب کیا تم سے بھی اسی طرح بات کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بولنے سے قبل ہی وہ میز پر مکا مارتے ہوئے بولا ”نہیں عقیل صاحب! صرف آپ کو اس قابل سمجھا، ورنہ درد کو سمجھنے والے لوگ ملتے کہاں ہیں اس خودغرض اور مکار دنیا میں..... کسی سے دس روپے ادھار مانگ لیں تو دے بھی دے وہ اگر تو آپ اس کے لاشعور میں ہمیشہ کے لیے بہت چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ آپ کا چہرہ عمر بھر اس ادھار یا بطور امداد دیئے گئے اس دس روپے کے نوٹ کے پیچھے چھپا رہتا ہے! یعنی آپ خواہ کتنی ہی قابلیت کے مالک ہوں آپ کی شخصیت زیرو بٹا زیرو ہو جاتی ہے“۔ اتنا کہہ کر اس نے انگلی سے زیرو کا نشان بنایا اور ایک نظر اس طرف جبکہ دوسری باقاعدہ میری طرف تھی۔

میں نے جواب میں مسکرانے پر ہی اکتفا کیا جبکہ دل میں سوچ رہا تھا کہ جو شخص جانتا ہے کہ دنیا خودغرض اور مکار ہے وہ بھلا خود اس وبا سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے کیونکہ اکثریت کے رنگ کا انفرادیت پر غالب آجانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حمام ایک ہو تو کوئی اگر ننگا نہ بھی ہونا چاہے تو کچھ دیر بعد ذہنی کیمسٹری بدل جائے گی اور ازراہِ تفنن ہی

سبھی رنگ ڈھنگ ڈھلتے ڈھلتے ڈھل ہی جاتے ہیں۔
اتنی دیر میں کھانا آچکا تھا۔ سیر شکم ہونے کے بعد اس نے عقیل سے چائے کی فرمائش کی جو پوری ہو جانے کے بعد عشق کے اور امتحان کی طرح سگریٹ کے انتظام کا مطالبہ بھی پرزور تھا۔ لیکن میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر فوراً اسے پیش کر دیا۔ سگریٹ پکڑتے وقت اس کے چہرے پر غصے اور ناراضگی کی ملی جلی کیفیات تھیں۔ معاملہ ناقابل فہم تھا۔ بہرحال سگریٹ ختم ہوتے ہی ہماری یہ محفل بھی برخاست ہوگئی۔ اس کے جانے کے بعد عقیل سے پوچھا کہ میرے سگریٹ دینے پر اس کا منہ کیوں لٹک گیا تھا۔

''اس لئے کہ اسے یقین تھا اگر میں انتظام کرتا تو کم از کم ایک پیکٹ تو ضرور ہوتا جبکہ آپ نے اس کے پیکٹ پر لات ماردی اور ایک سگریٹ میں ہی اسے نمٹا دیا'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''اوہ تو یہ بات..... ہائے..... ''ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے'' بے چارہ.....! میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''لیکن یہ تو بتاؤ اگر تم اس شخص کی طبیعت اور مزاج سے آشنا ہو تو پھر اسے گھر میں کھانا اور چائے وغیرہ کے علاوہ سگریٹ تک کا انتظام.....! ایسا برتاؤ پہلے کسی دوست کے ساتھ تو کبھی نہیں رہا۔

''بھائی اس کے قصے سن کر محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہو گے۔'' وہ جواب میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''اچھا اگر یہ بات ہے تو پھر گلے ہاتھوں کوئی ایک آدھ قصہ سنا ہی دو.....!'' اس مرتبہ دل میں تجسس کی لہریں ہلکورے لے رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے پھر سنئے -- ایک مرتبہ ویگن میں بیٹھے۔ جیب خالی اور سفر زیادہ تھا اور مایوسی اس سے بھی کہیں زیادہ -- لیکن آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود اس نے ویگن رکوائی اور مجھے بھی زبردستی اپنے ساتھ کھینچ لیا۔''

''اوہ تو پھر کیا ہوا۔'' وہ سانس لینے کے لیے گھڑی بھر کو رکا تو میری تیز ہو جانے والی ہر دھڑکن میں ایک ہی سوال تھا۔

''پھر وہی ہوا -- کنڈکٹر کے ساتویں مرتبہ ترش لہجے میں کرایہ مانگنے پر اس نے چیخ کر کہا ''بھئی نہیں ہے ہمارے پاس کرایہ تو تمہاری طرف سے طوطے کی طرح ایک ہی رٹ لگائے رکھنا اب تک خاموشی سے برداشت کر رہے ہیں''۔ کنڈکٹر اور اس کے درمیان گرما گرم بحث چھڑ گئی۔ میں خاموش کردار تھا۔ بالآخر کنڈکٹر نے ویگن رکوائی اور ہم دونوں کو نیچے اترنے کو

کہا۔ ''عقیل کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''اچھا--- اچھا سمجھ گیا، آگے کیا ہوا۔'' میں نے معاملہ فہمی کا مظاہرہ کیا۔

''نہیں..... آپ کچھ نہیں سمجھے۔ اصل بات تو اب شروع ہوئی ہے۔ میں تو فوراً نیچے اتر گیا لیکن موصوف نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بار بار کنڈکٹر کو کے دکھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا صرف تمہارے جیسے لوگوں کے لیے میں نے باکسنگ سیکھی ہے۔ جب ویگن میں باقی لوگ جا رہے ہیں تو ہم کیوں نہیں--- ہماری وجہ سے یہ ویگنیں اور ان کے مالکان تو الگ--- تمہارا بھی گھر بار چلتا ہے۔ روزانہ کرایہ دیتے ہیں آج اگر نہیں تو کونسا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔'' اتنا کہتے ہی عقیل کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ دہرا ہوا جا رہا تھا یہاں تک کہ بار بار پیٹ پکڑ رہا تھا۔ انداز بالکل ایسا تھا جیسے وہ سنا تو کوئی پرانا واقعہ رہا ہو لیکن وہ سب اس کی آنکھوں کے اچانک سامنے آ گیا ہو۔

''یار آگے بتاؤ - - - مجھے بھی ہنسی آ رہی ہے لیکن سسپنس بڑھ رہا ہے''۔ میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا لیکن چہرے پر مسکراہٹ برقرار تھی۔

''پھر یہ کہ ایک آدمی نے جو پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا پیسے نکال کر ہمارا کرایہ ادا کر دیا۔'' اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے بات مکمل ہو گئی ہو۔

''لو بھئی --- مطلب --- معصومیت، مجبوری یا پھر انسانی نفسیات کی مہارت --- جو بھی کہیں، ویگن تو چل پڑی ہو گی۔

''ہاں لیکن --- آپ نے کہا انسانی نفسیات کی مہارت --- جبکہ جس آدمی نے ہمارا کرایہ ادا کیا تھا اسے جانتے ہیں نوید اقبال نے انتہائی بے ہودہ لہجے میں کیا کہا --- یہی کہ کیا اتنی بحث اور اتنا ٹائم ضائع ہونے سے پہلے ادا نہیں کر سکتے تھے۔'' عقیل ابھی تک ہنس رہا تھا۔ اب میری بھی ہنسی رک نہ پا رہی تھی۔ عجیب آدمی تھا وہ بھی ---!

اس بات کو زیادہ عرصہ ..... نہیں یوں کہنا مناسب ہو گا کہ کوئی پانچ/ چھ دن ہی گزرے ہوں گے کہ ایک روز اچانک صبح گیارہ بجے کے قریب موصوف آ ٹپکے۔ عقیل تو گھر موجود نہیں تھا لیکن میرے بتانے پر کہ وہ گھر نہیں ہے۔ اس نے فوراً کہا ''تو کیا ہوا..... چلئے آپ تو موجود ہیں۔'' کچھ چونکا ضرور لیکن سوچا کہ اب کیا کیا جائے۔ یہ کھانا، چائے اور سگریٹ نوازی.....!''

میں ابھی اسی سوچ بچار میں تھا کہ وہ جھٹ سے بول پڑا۔ ''ارے بھائی..... میں نے صبح سے کھانا نہیں کھایا، اتنی دور صرف کھانے کے لیے آیا ہوں۔''

"کیا مطلب..... آپ تو اچھرہ رہتے ہیں..... تو کیا محض کھانے کے لیے اتنا فاصلہ طے کیا ہے جتنا آپ کا کرایہ لگا ہے اتنے میں تو اچھرہ میں ہی اچھا کھانا کھایا جا سکتا تھا۔" مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔

"ہاں کھایا جا سکتا تھا..... لیکن میرے پاس پیسے نہیں تھے.....!" اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"لیکن اگر آپ کے پاس پیسے نہیں تھے تو پھر آپ یہاں پہنچے کیسے' کرایہ کہاں سے ادا کیا۔" دل میں عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ یہ ایک دلچسپ کردار تھا یا پھر.....!

"آنے کا تھا کرایہ تھا میرے پاس..... اور رہا معاملہ جانے کا تو آپ ہیں ناں....." اس نے جھٹ سے کہا۔

"اوہ خدایا....." میں بڑبڑا کر رہ گیا۔

"جی کیا کہا آپ نے....." وہ خاموش نہ رہ سکا۔

"نن..... نہیں کچھ..... بس یونہی.....!" کچھ اور نہ سوجھا تو یہی کہہ دیا۔

"ارے میں نے سنا..... آپ نے خدا کو یاد کیا..... کتنی اچھی بات ہے، آپ نے خدا کو یاد کیا۔ ورنہ یہاں تو سال بلکہ بعض لوگ تو پوری زندگی خدا کو صرف ایک ہی مرتبہ یاد کرتے ہیں یا پھر اکثریت ایسا بھی نہیں کر پاتی۔" اس کے چہرے پر مسرت تھی۔

"لو بھئی..... یہ بھی خوب رہی..... یہ فلاسفر ہونے کے باوجود مُلا بھی ہے۔" میں نے دل میں سوچا اور پھر اسے اندر کمرے میں بٹھا دیا۔ باہر جاتے ہوئے میں نے کہا کہ سب انتظام ہو جائے گا۔ آپ بس خدا کو یاد کرو۔"

گھر والوں کو کھانے اور پھر چائے کا کہہ کر اندر آنے کے لیے دروازہ کھولا تو حیرت کا انتہائی شدید جھٹکا لگا۔ وہ کمبخت عجیب سٹائل میں کرسی پر آدھا جھک کر کھڑا پردے ہٹا کر کھڑکی میں سے باہر تا کا جھانکی کر رہا تھا۔ لیکن مجھے دیکھتے ہی آرام سے کرسی پر واپس براجمان ہو گیا تاہم اس کے چہرے پر کسی قسم کی شرمندگی، ڈر، خوف یا ندامت کے آثار نہیں تھے۔

اس کی اس حرکت کے بعد دل میں اس کے لیے جو دلچسپی یا عزت اور احترام تھا وہ سب یکدم بھاپ بن کر اڑ گیا۔ اسے گھر میں بٹھا کر کھانا کھلانے اور عزت دینے کا صلہ نہ ملتا تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اس کی انتہائی گھٹیا حرکت کے بعد اس کا پورا وجود مجھے کچرے کا ڈھیر دکھائی دینے لگا۔ دل تو چاہتا تھا کہ اسے اٹھا کر گھر سے باہر پھینکوں..... لیکن تھا بہت شرارتی..... اور نت نئی شرارتیں ایجاد کرنا ہی تو میرا وہ فن..... جس میں طاق تھا۔ کھانا کھلانا اس لئے ضروری تھا کہ اب

اسے کم از کم بھوکا مارنے کا کوئی ارادہ کم از کم نہیں تھا۔ کھانا ختم ہوا تو جانتا تھا اب چائے بھی چاہیے ہوگی سو انتظام کروایا۔ اب آخری مرحلہ تھا سگریٹ کا..... یہی ایک طریقہ تھا سبق کھانے کا.....! سو ایک انتظام اور کیا۔ اور پھر حسب توقع نوید اقبال نے چائے ختم ہوتے ہی سگریٹ کا مطالبہ کیا۔ میں نے فوراً سے پہلے سگریٹ اس کی خدمت میں پیش کیا ۔ جسے سلگانے میں اس نے بھی دیر نہیں لگائی۔

لیکن یہ کیا..... پہلا کش تو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا لیکن دوسرا کش لگاتے ہی ایسی زوردار کھانسی چھڑی کہ کھانستے کھانستے برا حال ہو گیا اس کا..... وہ بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا جبکہ میری مسکراہٹ اسے اور زیادہ چڑا رہی تھی۔ تقریباً دس منٹ بعد جب وہ سنبھلا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولنے کے قابل ہوا تو پہلا جملہ جو اس کے منہ سے نکلا وہ یہی تھا ''کیا ملایا تھا اس سگریٹ میں..... مرچ لگتی ہے..... آپ نے یہ تجربہ مجھ پر پہلی مرتبہ کیا ہے یا قبل ازیں کسی اور پر بھی کر چکے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر آپ یقیناً اس سے تعلقات ختم کرنا چاہتے ہوں گے۔''

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ وہ مسلسل میری طرف غضبناک اور اذیت ناک تقریباً برابر انداز میں دیکھے جا رہا تھا۔ بالآخر میں نے خاموشی کا قفل ذرا دبنگ آواز میں توڑا۔ چلئے نوید صاحب! سرخ مرچ بھری تھی سپیشل آپ کی تواضع کیلئے۔ اب آیئے آپ کو باہر کا راستہ دکھاؤں۔ دل تو کچھ اور چاہتا ہے لیکن اتنا کلائمیکس کافی ہے''

باہر آتے ہی اس نے کہا ''دنیا بہت ظالم ہے''۔ اس کی کھانسی کا دورہ ابھی تک قائم تھا البتہ اس میں پہلی سی شدت نہ تھی۔

میں نے ہنستے ہوئے صرف اتنا کہا۔ ''ابھی یہ مظاہرہ دیکھ لیا آنکھوں سے میں نے۔۔۔ آپ بھی تو دنیا ہی نکلے..... اور شکر منائیں کہ ایک شریف لیکن انتہائی شرارتی کے شر سے بچ گئے۔ یہ ابھی آپ کا لحاظ کیا ہے میں نے!''

''دیکھ لوں گا میں آپ کو.....!'' اس نے جاتے ہوئے ہوا میں مکا لہرایا۔

''ضرور دیکھئے گا مجھے..... جب آپ چاہیں..... لیکن مجھے آپ کبھی یہاں نظر نہ آئیں ورنہ خاطر کچھ زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔

اس نے واپس مڑ کر مجھے گھورتے ہوئے دیکھا لیکن صرف کھانستا ہی رہ گیا جبکہ ابھی تک آنکھوں سے نکلنے والے پانی کو صاف کرنے کیلئے ہاتھ مسلسل مصروف تھے۔

☆☆☆☆☆

کوثر کشید کرتا ہوں آنکھوں کے نم سے میں

شاعرِ امروز

عمار یاسر مگسی

شاہد ماکلی

عمار یاسر مگسی کی غزل کے ایک بڑے موضوعی حصے کا استعاراتی و تلمیحاتی نظام، کربلا اور اس کے تلازمات سے تشکیل پاتا ہے۔ اس لیے ان کی غزل دلوں کو گداز کرتی ہے؛ اور چونکہ ان کے تلازماتِ شعری ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ ہیں اس لیے ان کے ہاں کیفیاتی ابلاغ زیادہ پُرزور اور مؤثر ہے۔ عمار یاسر کی غزل کا دوسرا بڑا موضوعی حصہ عصر، سماج اور ذات کے نہاں خانوں سے پیوستہ رہ کر ایک ایسے معنوی منطقے کا سراغ دیتا ہے جو اعتبار اور نااعتباری کے مابین وجود رکھتا ہے۔ عمار اپنی حسیّت میں ایک نئے شاعر ہیں اور ان کی شاعری اُن ذہنی کیفیات اور روحانی بحران کی بلیغ نشاندہی کرتی ہے جن سے آج ہماری نوجوان نسل گزر رہی ہے۔ ان کی غزل برہنہ گفتاری سے پہلو تہی کرتے ہوئے ایمائیت کی طرف مائل ہے۔ اسلامی، تہذیبی اور مقامی استعارے اور تلمیح کے برجستہ برتاؤ نے ان کی شاعری کے رمزیہ پہلو کے امکان کو وسعت سے ہمکنار کر دیا ہے۔

عمار یاسر مگسی- 21 مئی 1979 کو کبیر والا کے نواحی علاقہ چک شیر گڑھ میں پیدا ہوئے۔ پاکستان ملٹری اکاؤنٹس میں ملازمت کرتے ہیں۔ درج ذیل انتخاب آپ سے انہماک بھری قرات کا متقاضی ہے:

انسان ملے کوئی تو رک جاتا ہوں کچھ دیر
رفتار بڑھا لیتا ہوں آوازِ سگاں پر

آپ جس بات پہ اترائے ہوئے پھرتے ہیں
ہم فقیروں میں اسے عیب گنا جاتا ہے

سنتی ہے مگر بات نہیں کرتی ہے مجھ سے
دیوار سمجھتی ہے کہ دیوار ہوں میں بھی

خدا، درخت، ستارے بھی رفتگاں کی طرح
بس اپنے پاس بلاتے ہیں پاس آتے نہیں

جتنا غمِ شبیر میں روتا ہوں میں اُتنا
پانی کا تناسب مرے گارے میں نہیں ہے

جب ثبوت اور زمانہ تھا محبت کے خلاف
میں نے اس وقت زلیخا کی حمایت کی تھی

تم جو پھر پوچھنے آئے ہو انہی باتوں کی
میں نے چپ رہ کے کئی بار وضاحت کی تھی

کسی گمان پہ کرتا نہیں یقین کبھی
کبھی یقین پہ ہوتا نہیں گمان مجھے

خدا کے عرش کا چکر لگانا پڑتا ہے
مجھے زمیں پہ مصلی بچھانا پڑتا ہے

کبھی تو یاروں سے بھی زخم کھانے پڑتے ہیں
کبھی عدو کو بھی پانی پلانا پڑتا ہے

کبھی تو خیمۂ دل میں تمہاری یاد کا اشک
مجھے چراغ سمجھ کر بجھانا پڑتا ہے

کچھ ایسے زخم ہیں جن کا کوئی علاج نہیں
سو ان پہ میر کا مصرع لگانا پڑتا ہے

مستقبل کا حال یہی ہے ماضی بن جاتا ہے یہ
آنے والی ساعت پل میں گزرا پل ہو جاتی ہے

پھر یوں ہوا کہ ضبط مرا ٹوٹنے لگا
پہلے تو رونے والوں پہ حیرت ہوئی مجھے

تجھ کو خبر نہیں ہے کہ مجلس میں بیٹھ کر
کوثر کشید کرتا ہوں آنکھوں کے نم سے میں

مرے خمیر میں خاکِ شفا بھی شامل ہے
دیا بجھاتا ہوں میں کشتیاں جلاتا نہیں

دستک سے بیزار نہیں ہے
در ہے یہ دیوار نہیں ہے

اسرافیل کو علم تو ہو گا
کوئی شے بیکار نہیں ہے

گرہ لگا کر چادر ڈالی مصرعے کی
میں نے دوسرے مصرعے کی عریانی پر

جہاں پہ تم نے کہا تھا انہیں خدا حافظ
رُکے ہوئے ہیں وہیں پر مسافرانِ عشق

بقا کی جنگ میں لے کر مدد محبت سے
عدو کے وار کو کرتا ہوں رد محبت سے

تصویر مرے دل میں ہے صحرائے عرب کی
ہاتھوں پہ کھلے جاتے ہیں کچھ پھول دعا کے

بقا کا اور فنا کا معاملہ ہے حضور
چراغ اور ہوا کا معاملہ ہے حضور

ہے ایک دل کو اجازت یہاں دھڑکنے کی
ہتھیلی اور حنا کا معاملہ ہے حضور

جب اپنے آپ میں خوبی کوئی دکھائی نہ دی
تو اپنے عیبوں کی تشہیر ہو گئے ہم لوگ

میں شہر واسی مجھے رزق تھل سے ملتا ہے
مجھے تو سانس بھی دستِ اجل سے ملتا ہے

سخن کے شہر میں جب بھی بھٹکنے لگتا ہوں
تو راستہ مجھے اردو غزل سے ملتا ہے

محبت اس لیے میرے لہو میں شامل ہے
بلوچ ہوں مرا شجرہ پُنل سے ملتا ہے

☆☆☆☆☆

اتنی خالی ہے مری آنکھ کہ بھر آئی ہے

شاعرِ امروز
احمد شہریار

شاہد ماکلی

احمد شہریار وہ خوش نصیب شاعر ہیں جن پر کشف اور حیرت کے باب اوائل عمری میں ہی کُھل گئے ہیں۔ اظہار کا سلیقہ ان کی جبلت میں شامل ہے۔ ان کے ہاں فکر و جذبہ کو جمالیاتی و تمثیلی سطح پر آمیز کرنے کی فنکارانہ قدرت وہبی زیادہ اور اکتسابی کم ہے۔ نئے امکانات دریافت کرنے کی دھن انھیں آگے سے آگے گرم سفر رکھتی ہے۔ احمد شہریار نہ صرف اردو کے عمدہ شاعر ہیں بلکہ وہ بہترین فارسی غزل گو اور مترجم بھی ہیں۔ ان کی فارسی غزل میں سبکِ ہندی اور بالخصوص، بیدل کے اسلوب شعری کی چاشنی ملتی ہے۔ وہ کئی ایرانی شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے اردو تراجم کر چکے ہیں؛ اور کئی اہم اردو تخلیقات کا فارسی ترجمہ کر چکے ہیں۔ ''تماشا'' اور ''اقلیم'' کے نام سے ان کے اردو شعری مجموعے جبکہ ''پیرہن گم کردہ ام'' کے نام سے ان کا فارسی مجموعۂ غزل شائع ہو چکا ہے۔ ''دھند میں دھنک'' کے نام سے ایرانی شاعر محمد جواد آسمان کی نظموں کا ترجمہ؛ ''کرنیں'' کے نام سے محمد رضا سرشار کی کہانیوں کا ترجمہ، اور ''نئے رنگوں کی دھنک'' کے نام سے جدید ایرانی شاعری کا انتخاب کر چکے ہیں۔

احمد شہریار۔ 25 جون 1983 کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ ایران میں مقیم ہیں اور اپنی اعلیٰ فارسی شاعری اور ادبی خدمات کی بنا پر وہاں کے ادبی حلقوں میں فعّال اور مقبول ہیں۔ ان کی شعری اقلیم میں داخل ہونا ایک نئے جہانِ حیرت میں داخل ہونا ہے اور اس مقام پہ بے ساختہ، بیدل کا شعر یاد آتا ہے:

مژگاں بہ کارخانۂ حیرت گشودہ ایم
در دستِ ما کلیدِ در باز دادہ اند

شعری انتخاب

کمانِ وقت سے نکلا تھا ایک تیر کبھی
جدھر میں سینہ سپر تھا، اُدھر نہیں آیا

کوئی پرانی سی تصویر ہے یہ دنیا بھی
کہیں سے صاف، کہیں سے مڑی تُڑی ہوئی ہے

میں وقفے وقفے سے خاموش ہوتا جاتا ہوں
یہ خامشی مری آواز سے جڑی ہوئی ہے

میں آسماں بناتا ہوں زنداں کی سقف پر
اتنے میں آپ کوئی پرندہ بنائیے

وہ مری خامشی نہیں سنتا
مجھ سے آواز دی نہیں جاتی

میں زخم زخم نہ پہنچوں تو منزلِ مقصود
مرا تمام سفر میرے منہ پہ مارتی ہے

بہت مضبوط ہیں باہر سے شہروں کی فصلیں
اسی خاطر ہمیں اندر سے ڈھایا جا رہا ہے

ایسے رہتے ہیں شہر میں انسان
جانور جیسے بن میں رہتے ہیں

شعر میں آئیں تو قیامت ہو
جو خیالات من میں رہتے ہیں

سحر قریب ، ملاقات ہوگئی اپنی
میں شہرِ صبح سے نکلا ، وہ شام سے آیا

زمیں ہو، آسماں ہو، سب کو خطرہ ہے ہمیں سے
ہمارے بعد دنیا خوف سے عاری رہے گی

ندامتیں اسے آوارہ کر گئیں احمد
وہ قتل گاہ سے نکلا تو گھر نہیں آیا

یہ میرا دل جو تیری یاد سے ملا ہوا ہے
عجیب صید ہے ، صیاد سے ملا ہوا ہے

میں آسماں کو برا بھی تو کہہ نہیں سکتا
مری زمیں پہ کئی لوگ آسماں کے بھی ہیں

کوئی دریا نہیں کہ پار کروں
دیدۂ نم ہے میرے رستے میں

ہم کہاں ہیں؟ یہ ہمیں خود بھی نہیں ہے معلوم
راز کی طرح زمانے سے چھپائے گئے ہم

دنیا مرے خیال سے ہو کر گزر گئی
اس طرح جیسے نور ہو شیشے کے آر پار

یہ سوچ کر بناتا ہوں جنگل میں جھونپڑی
آخر کبھی تو شہر بدر ہوگا شہر یار

مدح سے ختم ہو دیرینہ گناہی ، آمین
اشک دھوئیں مرے چہرے کی سیاہی، آمین

عین ممکن ہے کسی لمحۂ بیزاری میں
تُو مری سمت بڑھے اور میں دنیا کی طرف

میں نے اک روز گرداب کا اور بگولے کا ماتم کیا
پھر اچانک مرے گرد سب بحر و بر رقص کرنے لگے

پرندگاں کے لیے عرصۂ پر پرواز
فلک کا بوجھ سروں پر سنبھالنے سے بنا

کہیں نہ تھا کوئی رستہ سمندروں کی طرف
مگر پہاڑ سے دریا نکالنے سے بنا

پامال ہو رہی ہے مری عمرِ رائگاں
اے دن ذرا سنبھال کے، اے رات دیکھ کر

مختصر یہ کہ مرا صبر ابھی ناقص ہے
مجھ سے دیکھا نہیں جاتا کوئی جاں دادۂ صبر

یہ وہم یعنی 'جو موجود نہیں، وہی تو ہے'
میں اک جہان بناؤں گا اس توہم سے

تم بھی یہ بات سمجھ لو تو خوشی سے مر جاؤ
صاحبو! عشق میں ہوتا ہے نہ ہونا، ہونا

اٹھا وجود کا شور اور میرے دم سے اٹھا
میں آنکھ ملتا ہوا بسترِ عدم سے اٹھا

زمیں کی راکھ مرے نقشِ پا سے باہر کھینچ
اور آسمان کا ملبہ مرے قدم سے اٹھا

کھلا کہ بارِ امانت سرے سے تھا ہی نہیں
خلا کا بوجھ تھا، اتنا بڑھا کہ ہم سے اٹھا

ہم ایک ساتھ اٹھے ایک دوسرے کے لئے
تم اس جنم سے، میں اک دوسرے جنم سے اٹھا

میں تھا ، موجودگی نہ تھی میری
سب نے محسوس کی کمی میری

آہ بھرنا ہے عمر بھر مجھ کو
عمر ہی کیا ہے آہ ابھی میری

شور اٹھا ، شور بھی قیامت کا
اور اک بات رہ گئی میری

رہنے دے کوئی نقص جہاں کی سرشت میں
تخریب کا جواز بھی تعمیر سے نکال

میرے تمام رنگ مرے خوں سے اخذ کر
اور میرے خال و خد مری تحریر سے نکال

انکار کا عذاب اترنے کو ہے یہاں
تو اپنا آپ شہرِ اساطیر سے نکال

لہجہ بھی بہت خوب، روانی بھی غضب ہے
دریا نے لکھا ہے مرے اشکوں کا قصیدہ

صحرا مری رفتار سے یوں بھاگ رہا ہے
صیاد سے جیسے کوئی آہوئے رمیدہ

اس سنگ کی قیمت جسے معلوم تھی، اس نے
دل بیچ کے بازار کا بازار خریدا

یادوں کی تجسیم پہ محنت ہوتی ہے
بیکاری بھرپور مشقت ہوتی ہے

ایسا خالی اور اتنا گنجان آباد
آئینے کو دیکھ کے حیرت ہوتی ہے

دیواروں کا اپنا صحرا ہوتا ہے
اور کمروں کی اپنی وحشت ہوتی ہے

اس کو یاد کرو، شدت سے یاد کرو
اس سے تنہائی میں برکت ہوتی ہے

میں ہوں ذرے کا آخری ذرہ
اس کو لیکن بڑا دکھائی دیا

باغ میں اتنے پرندے ہی نہیں ہیں شاید
جتنے صیاد نے اب دام بچھائے ہوئے ہیں

کوئی سورج کے نکلنے پہ نہیں ہے مائل
سبھی خوش ہیں کہ کوئی دیپ جلائے ہوئے ہیں

ہر ایک صبح نکلنا ہے تازہ دم ہوکر
بنا رہا ہوں میں یہ گھر فقط سفر کے لئے

کتابِ عشق سے محذوف کرکے باب وصال
کہا کہ عیب ضروری نہیں ہنر کے لئے

تمہاری آنکھوں سے دیکھا تھا میں نے دنیا کو
سو منظروں نے بھی بوسے مری نظر کے لئے

یہ خون یونہی پھول کھلاتا ہے خزاں میں
آنکھوں سے ٹپک کر، کبھی سینے سے ابل کر

اِس پیشِ نظر، نقطۂ موہوم کو پھیلا
اس ذہن میں آئے ہوئے مصرعے کو غزل کر

کبھی نہ لوٹ کے آئیں گے آپ، جانتا ہوں
پر آیئے تو مرا انتظار دیکھیے گا

حدِ گماں سے ایک شخص دُور کہیں چلا گیا
میں بھی وہیں چلا گیا، میں بھی گذشتگاں میں تھا

شہر میں دشت کہاں، دھوپ کی دیوار کہاں
اک تصور نے مجھے آبلہ پا رکھا ہے

آہ! کتنی دیر سے میری طرح کا ایک شخص
سامنے بیٹھا ہے اور بار دگر آنے کو ہے

میری خاموش نگاہی پہ نہ جاؤ کہ یہ چپ
میرے اظہار کی شدت بھی تو ہو سکتی ہے

جہان تیری نظر کے سوا نہیں کچھ بھی
میں اس جہاں میں نہیں ہوں، تری نظر میں ہوں

آرزوئے غمِ نایاب بہت ہے مجھ کو
دیکھتا بھی نہیں میں رنجِ مہیا کی طرف

یوں بھی ممکن ہے کہ اک لمحۂ بیزاری میں
تو مری سمت بڑھے اور میں دنیا کی طرف

اور جس روز مرا خواب سبھی دیکھیں گے
شہر کا شہر نکل آئے گا صحرا کی طرف

کشتۂ صبر کو کیا معرکۂ تیغ سے باک
کوئی لے جائے مجھے لشکرِ اعدا کی طرف

یہ ہم جو شہروں کے شہر مسمار کر رہے ہیں
کہیں بگولوں کی راہ ہموار کر رہے ہیں

سنو کہ ہم شہرِ خامشاں میں کلام کر کے
بس اپنی آواز کو گنہگار کر رہے ہیں

قصور سارا ہوائے سرکش کا ہے تو احمد
یہ لوگ خوشبو کو کیوں گرفتار کر رہے ہیں

ایک زنداں تھا، کچھ دیے اس میں
ہم بہت روز تک جیے اس میں

صاف پانی گلاس میں بھر کر
آسماں قید کیجیے اس میں

اے جہاں! ہم سے یہ زندانِ پسندیدہ نہ چھین
تیری وسعت سے تو سمٹے ہیں دل تنگ میں ہم

تصویروں میں جلتا شہر
کب سے سرو الاؤ میں ہے

اب ذرے ذرے کا ہاتھ
صحرا کے پھیلاؤ میں ہے

چراغ آئے نہ آئے ہوا کے قافیے میں
فنا تو آئے گی پیارے بقا کے قافیے میں

میں شہر یار ہوں اور میرا نام آتا ہے
نہ ابتدا، نہ کہیں انتہا کے قافیے میں

پہلے نئی بہار کے امکان دیکھنا
پھر مسکرا کے اپنا گریبان دیکھنا

اچھا شگن نہیں ہے مکینوں کے باب میں
دیوار و در کا خواب پریشان دیکھنا

مجنوں کو خواب میں جو بہت دیکھتے ہو تم
اک روز اپنے گھر کو بیابان دیکھنا

اس عالمِ کہن میں نیا کیا بنایئے
یعنی جو بن چکا، وہ دوبارہ بنایئے

اک بحرِ خشک ڈھونڈیے صحراؤں میں کہیں
پھر اس میں پانیوں کا جزیرہ بنایئے

رکھیے کچھ اس طرح کبھی ترتیبِ نقشِ پا
جب آخری بنایئے ، پہلا بنایئے

ہم سے وہ خواب دیکھا نہیں جا سکا
لوگ کہتے ہمارا تمہارا جسے

خال و خد اور بے خال و خد کے سوا
ایک روپ اور تھا ہم نے دھارا جسے

ملنا کہاں تھا حلقۂ احباب سے مجھے
جو احترام حلقۂ زنجیر سے ملا

جس خرابے میں نہیں خلقِ خدا کو رہنا
میں ہی رہ جاؤں اگر خلقِ خدا رہنے دے

دن نکلتے ہی یہاں آگ بھڑک اٹھے گی!
سو ابھی رات کے جنگل کو ہرا رہنے دے

لئے جاتی ہے ہوا ساری لویں اپنے ساتھ
جنہیں رہنا ہی نہیں ہے، انہیں کیا رہنے دے

جو ضد پہ ہیں، انہیں اپنی ڈگر پہ لاتا ہوں
میں گھومتے ہوئے ارض و سما گھماتا ہوں

بس ایک رنگ ضروری ہے، رنگِ بے رنگی
میں اپنے خواب اِسی رنگ سے بناتا ہوں

وہ اضطراب ہے مجھ کو غزل کے بارے میں
کہ جیسے کوئی پریشاں ہو کل کے بارے میں

بے شکل پانیوں کی تہوں سے ابھر بھی آئے
حیرت اگر چہ پیشِ نظر ہے، نظر بھی آئے

اب مجھ پہ خامشی کی ہے تہمت دھری ہوئی
الزام اگر یہی مری آواز پر بھی آئے!

اس بار سب شریک تھے وحشت کے جشن میں
بیعت کنانِ عرصۂ دیوار و در بھی آئے

بس یہی سوچ کے رکھتا ہوں میں اس دل کا خیال
شیشہ ہوتا ہے تو شیشے میں پری آتی ہے

اتنے شاداب مناظر میں بھی حیرت کے سبب
اتنی خالی ہے مری آنکھ کہ بھر آئی ہے

صاحبو! پھر مرے دروازے پہ مہماں کی طرح
کہیں جاتی ہوئی اک راہ گزر آئی ہے

مدتوں بعد پرندوں کی زبانی احمد
سبز ہوتے ہوئے موسم کی خبر آئی ہے

جنہیں خریدنا پڑتی ہے اشک اشک خوشی
بڑے جتن، بڑے آزار سے خریدتے ہیں

خریدتے ہیں وہی جنس جو دکاں میں نہیں
کہ ہم سکوت ہی گفتار سے خریدتے ہیں

فروخت کرتے ہیں جو آئنوں کو حیرانی
وہی دوبارہ خریدار سے خریدتے ہیں

جگر کے رنگ سے خالی ہیں جن کے اشک، وہ لوگ
یہ رنگ، سرخیِ اخبار سے خریدتے ہیں

کتنی مدت ہوئی اب کہ میرا لہو آستینوں کے دل سے نہیں بہہ رہا
اور ایسے میں پانی کی اک بوند بھی میری آنکھوں سے جاری نہیں ہو رہی

دل گرفتہ ہوں میں، پا شکستہ ہوں میں، ایک لمحہ ہوں میں اپنے ادوات کا
مجھ سے پہنچا نہیں جا رہا وقت تک، وقت سے انتظاری نہیں ہو رہی

تا کمالِ اوجِ فلک بھی تجھے دکھاؤں گا میں
جب اپنے سائے پہ اپنا بدن گراؤں گا میں

یہ شہر، شہرِ خموشاں ہے، جانتا ہوں مگر
یہاں بھی زور سے اک قہقہہ لگاؤں گا میں

اندھیری رات ہے اور دیکھتا ہوں صبح کے خواب
یہ خواب ترک کروں گا تو مر نہ جاؤں گا میں!

چل رہی ہے ایک تیغ، بے دریغ
کٹ رہے ہیں بے گناہ، واہ واہ!!

میں کہ اپنے گھر میں ہوں، سفر میں ہوں
منزلیں ہیں زادِ راہ، واہ واہ

لازمی ہے شاعری کبھی کبھی
لازمی ہے گاہ گاہ واہ واہ

خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو پاتے
خواب میں طالعِ بیدار لئے پھرتے ہیں

بس ایک نزع کا عالم ہے اور اس کے بعد
خدا کے نام سے کرتا ہوں ابتدائے سکوت

صدا سنی نہ سنی، لیکن آخرش احمد
خدا نے سن ہی لیا نالۂ رسائے سکوت

کس قدر صاف و بے ریا ہو تم
شہر میں گاؤں کی فضا ہو تم

ایسے لوگوں سے میں نہیں ملتا
جو یہ کہتے ہیں بے وفا ہو تم

شرم سے خود بھی ہو گئے غرقاب
ڈوبتی ناؤ دیکھنے والے

جائے عبرت ہے منظر خالی
کچھ تو گھبراؤ، دیکھنے والے!

اور تو کیا ہے دیکھنے لائق
خواب لے جاؤ دیکھنے والے

زمین گھوم رہی تھی سو میں کہاں جاتا؟
میں اپنے گھر میں رہا اور گھر سفر میں رہا

رستہ آپ بتا سکتا ہے
کون کہاں تک جا سکتا ہے

بڑھتا ہوں میں جب عرصۂ ویروز کی جانب
بنتے ہیں مرے نقشِ کفِ پا مرے آگے

اکثر میں یونہی دیکھ رہا ہوتا ہوں احمد
اکثر کوئی منظر نہیں ہوتا مرے آگے

جو حرفِ کہنہ سے آنکھیں نہیں ملاتا میں
جوازِ معنیِ تازہ کہاں سے لاتا میں

فقیرِ در ہوئے ان صاحبانِ حال کے ہم
جو دکھ اٹھائے گئے اور مسکرائے گئے

دل کے صحرا میں، سرِ شام، یہی پھیلتی چپ
صبحِ مقتل کی اذاں ہے، مجھے معلوم نہ تھا

یہ شہرِ بے در و دیوار دل میں تھا آباد
تلاشِ گمشدگاں میں کہیں نہیں گئے ہم

قدم سے لپٹا ہوا ہے جو راستہ اب تک
وہ راستہ کسی جانب بچھا کے دیکھتے ہیں

☆☆☆☆☆

والد (مرحوم) کے لیے ایک نظم

اس طلسمِ حیات میں میری
آنکھ کھلنے کے اولیں پل سے
ان کی آنکھوں کے بند ہونے تک
اک تسلسل کبھی نہیں ٹوٹا
کوئی مشکل گھڑی نہ تھی ایسی
حوصلہ خیز وہ نظر اُن کی
جب مرے ہم قدم نہ آئی ہو
ان کی مانوس دلربا تھپکی
ظلمتوں میں نہ جگمگائی ہوئی

اُن کو معلوم یہ حقیقت تھی
وقت روکے سے رک نہیں سکتا
یہ جو اَب ہیں سوال ، بدلیں گے
اُن پہ یہ راز آشکارا تھا
یہ جو بدلے تو پھر جوابوں کی
شکل اور ساخت بھی نئی ہو گی
رات دن ، ماہ و سال بدلیں گے
جب نئی روشنی کھلے گی تو
سب پرانے خیال بدلیں گے

مرحلے زندگی کے ہوں یا پھر
در و دیوار آشیانے کے
اُن کی خوشبو ہے ہر جگہ موجود!
ان کے لہجے کی روشنی اب بھی
ہر اندھیرا اُجال دیتی ہے
کس قدر دلربا یہ ناتا ہے
میرے بچوں سے، اُن کے بچوں تک
ایک شفقت کا سائباں جیسے
ہر طرف پھیلتا ہی جاتا ہے

باپ کے دل سے ہو سوا، ایسا
کوئی دریا عمیق ہے ہی نہیں!
زندگی کے بکھرتے رستوں میں
کوئی ایسا شفیق ہے ہی نہیں!
دوست بھی ، راہبر بھی ، ناقد بھی
باپ جیسا رفیق ہے ہی نہیں!

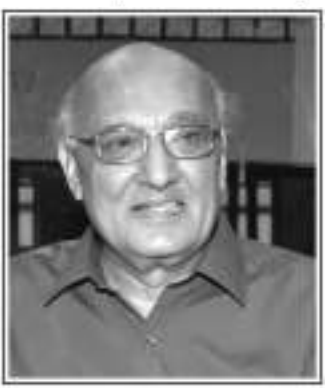

امجد اسلام امجد

کُلُّ مَن علیہا فان.....

کیوں بھلا گریہ کناں ہیں یہ جنازہ بردوش
کس کی آنکھوں سے چھلکتا ہے سمندر کوئی
نوحہ پڑھتے ہوئے یہ لوگ فسردہ کیوں ہیں
کون گزرا ہے کہ میں بھی ہوں اسی مجمع میں
کسے کاندھوں پہ اُٹھائے ہوئے جاتا ہے ہجوم
کس کا تابوت ہے
کُھلتی ہی نہیں بات کوئی
چادریں پھولوں کی ہیں کیوں سرِ قبر احساس
خود کو میں ہاتھ لگاتا ہوں تو لگتا ہی نہیں
بدن اپنا کہیں موجود نہیں پاتا ہوں
رُوح بھی مائلِ پرواز ہے برزخ کی طرف
جیتے جی کیوں میں گلابوں میں ڈھکا جاتا ہوں
آنکھیں موندے ہوئے ہوں اور تھکا جاتا ہوں
مُشک کافُور کے یہ پھول سرِ شاخِ وجود
نکہتیں بانٹتے پھرتے ہیں عزاخانے میں
دکھ کے پاتال سے مغموم صدا آتی ہے
یار تابش! ذرا ٹھہرو کہ سفر دُور کا ہے

تابش کمال

اینگزائٹی (Anxiety)

جبڑے بھنچ جاتے ہیں
سوچوں کا ہل کھینچتے کھینچتے
جیون کھیت کو
اندیشوں کی بہتی نہر سے سینچتے سینچتے
خدشوں کے تھیلے سے مٹھیاں بھر بھر
بیج سے کا پھینکتے پھینکتے
جسم کے پٹھے کھنچ جاتے ہیں
دھیان میں رہتی بے دھیانی میں
اپنی ہی سختی سے جبڑے بھنچ جاتے ہیں

ایک تناؤ اندر کا ہے
ایک کھنچاؤ باہر کا
یادسمندر میں اک لہر سی لہراتی ہے
آنکھ تک آنے سے پہلے ہی مٹ جاتی ہے
کون آیا تھا؟
کس کا چہرہ یاد آنے سے پہلے بھول گیا؟
روشن پردہ دُھندلاتا ہے
گھور خلا کو گھورتے گھورتے
خالی دیدے مچ جاتے ہیں
نادیدہ الجھن سے جبڑے بھنچ جاتے ہیں

شہزاد نیر

عازمینِ حج کے نام [عقیدت]

میسر جو نہیں مجھ کو یہاں اِملاک لے آنا
مدینے کی گلی سے تُم، اُٹھا کر خاک لے آنا

مِری تسبیح بن جائے گی، موتی کام آئیں گے
بچا لینا کچھ آنسو، دیدۂ نم ناک لے آنا

لگایا تھا نبی نے جو کبھی، خود اپنے ہاتھوں سے
جو ممکن ہو تو، تم اس پیڑ کی مسواک لے آنا

مجھے بھی اِن اندھیروں میں اُجالوں کی ضرورت ہے
تجلیاتِ دربارِ رسولِ پاک لے آنا

سنو، میرے لئے بھی واپسی پر شہرِ حکمت سے
شعورِ زندگی تھوڑا سا، کچھ اِدراک لے آنا

ہمارا شہر تاریکی میں ہے ڈوبا ہوا، کہنا
تُم انوارِ مزارِ سیدِ لولاک لے آنا

جو جلوے بھی نظر آئیں، بسا لینا تم آنکھوں میں
غذا میرے بدن کی، روح کی خوراک لے آنا

نئی تعمیر کے نیچے ہے، اُن کے لمس کی خوشبو
جو ممکن ہو، زمیں کا سینہ کر کے چاک لے آنا

لپٹ کر اِس سے جو بھی مانگنا ہے، مانگ لوں گا میں
حرم کے جسم سے اُترے گی جو پوشاک لے آنا

دکھوں کا کون کہتا ہے؟ مداوا ہو نہیں سکتا
وہاں مِل جائے گا، تُم زہر کا تریاک لے آنا

سید عارف معین بلّے

جھوٹی امو

اموآپ بہت جھوٹی ہیں
آپ نے پہلے خود ہی کہا تھا
اموکا بے بی اموکا بچو___
اموکا جانو سونو، ببو، لاڈو، پارو
اوراب مجھ سے خود کہتی ہو
بچے اپنے ماما بابا کے گھر میں ہی رہتے ہیں
اموآپ بہت جھوٹی ہو
دیکھو امو میرے بازو
میں نے انکو کتنا کھولا، اتنا کھولا جتنا بڑا سکائی ہے
کتنا زیادہ پیار ہے مجھکو.....آپ سے امو
دیکھو امو
نومی خالہ، سارا، موسیٰ،
عینی، راجو
پاپا نوی کو آپ نے اپنے پاس رکھا ہے.....
مجھ کو واپس بھیج دیا ہے۔ اموآپ بہت جھوٹی ہو
آپ نے پہلے خود ہی کہا تھا
ریانو امو کا ڈارلنگ ہے ریانو امو کا چندو ہے
ریانو امو کا سونم ہے
امو جی مجھے یہی تو غم ہے
میں نے آپ کے گھر آنا ہے
بگ بس کی سیریں کرنی ہیں
آپکی ڈریونگ سیٹ پہ میں نے بیٹھنا ہے
آپ کے ساتھ ہی زو وجانا ہے
میں نے آپ کے گھر آتا ہے
اموآپ بہت جھوٹی ہو
اموآپ یہ کیوں کہتی ہو
آپ کے گھر نہیں آسکتا ہوں
آپ کا گھر کہیں دور بہت ہے
آپ کی گود جب چاہے میں اس کو بھی نہیں پاسکتا ہوں
میری امو میں نے آپ کے گھر آنا ہے
آپ کے گھر مرا من لگتا ہے
دیکھو امو میں پھر رویا.....
میں پھر راتوں کو نہیں سویا
ایروپلین کو دیکھ کے پھر آواز لگاؤں
میں اپنی امو گھر جاؤں
آپ نے پہلے خود ہی کہا تھا
اموکا چنو.....اموکا لالو، اموکا بابو
اموآپ بہت جھوٹی ہو
جاؤ امو آپ سے کٹی،
آپ سے میری کٹی پوری
میرا چھوٹا سا یہ دل
کیسے کرے برداشت یہ دوری.....
اموآپ بہت جھوٹی ہو

رخشندہ نوید

آفتاب عالم کی کتاب ''دریائے ظرافت'' پر منظوم تبصرہ

آنکھوں میں سمانے لگا دریائے ظرافت
کی ہے جو مرتب نے لگاتار تگ و دو

پھر دل کو لبھانے لگا دریائے ظرافت
محسوس ہوا کی ہے دھواں دھار تگ و دو

چھب اپنی دکھانے لگا دریائے ظرافت
در در جو صدا جا کے لگائی ہے انھوں نے

طغیانی پہ آنے لگا دریائے ظرافت
مشکل سے لگن آس کی پائی ہے انھوں نے

گستاخ گیاوی کے پسر نے ہے یہ لکھی
دیکھیں جو اسے کیف سا پاتے ہیں سُخن ور

باوا کی محبت سے یہ تکمیل کو پہنچی
گُن اس کے مزے لے لے کے گاتے ہیں سُخن ور

ہر ہزل گو شاعر کا کیا حال قلم بند
اعلیٰ ہیں بہت اس میں ظرافت کے نمونے

پیدائش و سال کا ہے سال قلم بند
ڈھونڈو گے تو مل جائیں گے آفت کے نمونے

آٹے میں نمک جتنے ہیں یہ طنزیہ شاعر
یاربّ یہ شجر پھولے پھلے یونہی ہمیشہ

محفل کو جگا دیتے ہیں یہ طنزیہ شاعر
ہر سال ثمر بار رہے یونہی ہمیشہ

دریائے ظرافت کی جو تمثیل ہوئی ہے
عاصیؔ کی دُعا ہے کہ سدا مہکے یہ گُل بن

عالم کے حسیں خواب کی تکمیل ہوئی ہے
خوش رنگ طیوروں سے سدا چہکے یہ گُل بن

لو اس کی مہورت ہوئی احباب کے ہاتھوں
تکمیل کی صورت ہوئی احباب کے ہاتھوں

مرزا عاصی اختر

شکست کا بین الاقوامی چارٹر

دائرے میں
نجانے کتنے دُکھ رقص کرتے ہیں
ذہنوں سے چپکے
چند فراموش شدہ خواب
وقت کی آگ میں جلتے ہیں

غموں سے چھینے ہوئے
چند قہقہے
خوشیوں کے بھیس میں
دل کی گلی میں گشت کرتے ہیں
ہم زخمی سانسیں لیے
(چند سانسی تو جیہات کی بدولت)
اپنے سہارے جب چلتے ہیں
توڑ کنے کے تیز و تند اشارے
پاؤں کے جوتے کاٹتے ہیں

ہم ایک سفر کی کہانی کے پلاٹ میں
نجانے کتنے کرداروں کے سنگِ میل
حادثوں کی چارج شیٹ
کڑوے بادام تھوکتے ہیں

ہم غلطیوں کے مرتبان کی پھانکوں سے
پیچیدگی سے اٹی، ناممکنات کی دُھول چاٹتے ہیں

ہم خود کو
اگر کسی موڑ پر جانتے ہیں
وقت کی سوئیوں کی چبھن
جسم سے گذارتے ہیں
جیت کی خوش فہمی کا جشن منا کر
کمزور لمحے کی آغوش میں ہارتے ہیں

امجد بابر

گستاخی

تمہارے ذہنوں پہ بت پرستی کے اب
بھی تالے پڑے ہوئے ہیں
تمہیں تمہاری ہی بے یقینی نے ڈس لیا ہے
جکڑ لیا ہے تمہیں تمہاری ہی بے حسی نے
خدا سے دوری نے تم سے بینائی چھین لی ہے
دلوں پہ غفلت کی سرخ مہریں لگی ہوئی ہیں
اسی لئے تو یہ کر رہے ہو زباں درازی

تمہارے اندر جو بغضِ احمد کے تیز شعلے
بھڑک رہے ہیں
جوان سے نفرت کا گرم لاوہ دہک رہا ہے
اسی میں جلنا ہے تم نے آخر

نہ ان کا رتبہ گھٹا سکو گے
نہ ان کی عظمت پہ حرف کوئی
تمہاری باتوں سے آنے والا
نہ ان کی رفعت کے آسمانوں کو چھو سکو گے
تمہاری وقعت تو ایسے کیڑے سی بھی نہیں ہے
جو گندگی میں پڑا ہوا ہے

تمہیں یہ اچھی طرح پتا ہے
ہمیں وہ جاں سے عزیز تر ہیں
جوان کے بارے میں ایک بھی حرف بد کہے گا
وہ کیسے دنیا میں پھر جیے گا
سو تم بھی لازم ہے مرتے دم تک
حصار مانگو گی عافیت کا
سکون کو ڈھونڈھتی پھرو گی
مگر نہیں اب یہ ملنے والا

یہ بات اپنے دلوں کے مندر پہ نقش کر لو
اور آنے والی تمام نسلوں کو بھی بتا دو
ہر ایک ظلم و ستم کو گر چہ
ہم اپنی جاں پر سہار لیں گے
معاف کر دیں گے چھوڑ دیں گے

مگر یہ ناموسِ مصطفےٰ ہے
یہاں معافی نہیں ملے گی
یہاں معافی نہیں ملے گی

سرور حسین نقشبندی

گھگھو گھوڑا

کھلونے بیچتی
خانہ بدوش اک خوبرو عورت
کی بغلوں میں پسینے سے

نظر پلٹی
تو آنکھوں میں
پرانے گھر کے دروازے پہ جا اٹکی
جہاں بچپن بھی ویٹنگ لاؤنج میں بیٹھا مسافر تھا
فقط وہ کچھ روپے لے کر
مہینے بھر کی خوشیاں دے کے جاتی تھی
میں کہتا تھا۔۔۔
مرے دل کو ترا گھوڑا ہی بھاتا ہے
اِسے دے دو
وہ کہتی تھی۔۔۔
یہ گھگھو اور گھوڑا ہے
ازل سے ان کا جوڑا ہے
یہ جوڑا ہی ملے گا اور اکیلا میں نہ بیچوں گی
بڑا گھگھو ہے تو پگلے!!

خدا نے ان کے جوڑے آسمانوں پر بنائے ہیں
مری بدقسمتی دیکھو
پرانی دشمنی کا بوجھ کاندھوں پر اٹھاتا ہوں
میں سب فرسودہ رسموں کو نبھاتا ہوں
میں اب اپنے قبیلے کے بزرگوں کا کھلونا ہوں
جنھیں معلوم ہے
جوڑے۔۔۔
ہمیشہ آسمانوں سے اُدھر
تشکیل پاتے ہیں
مگر وہ خود خدا بن کر زمیں پر ہی بناتے ہیں
میں لندن سے پلٹ آیا ہوں
اپنی ڈگریاں لے کر
مگر میں اب بھی گھگھو ہوں۔۔
میں گھوڑا ہوں
جو نیلے آسمانوں پر نہ بن پایا وہ جوڑا ہوں

زعیم رشید

دامن میں اک پہاڑ کے۔۔۔۔۔

(SAMUEL ROGERS کی نظم "A WISH" کا آزاد ترجمہ)

دامن میں اک پہاڑ کے کٹیا بناؤں گا
میں چھوڑ کر نگر، کوئی جنگل بساؤں گا
ہر صبح بھیرویں مجھے گا کر سنائے گی
کانوں میں رس پڑے گا، مگس بھنبھنائے گی
چکّی مری چلائے گی بہتی ہوئی ندی
جھرنوں کے نیلے جل سے، ہری گھاس سے بھری
اس چھت کے نیچے رہنے ابابیل آئے گی
گارے کے گھونسلے میں بہت چہچہائے گی
مہمان تحفہ لائے گا اک جانماز کا
کھائے گا ساتھ کھانا وہ زائر حجاز کا
مہکیں گے سبز بیل پہ واں صبح و شام پھول
لپٹیں گے پی کے بام سے، شبنم کے جام پھول
پہنے ہوئے وہ آئے گی اک نیل گوں لباس
کاتے گی چرخہ بیٹھ کے پھولوں کے آس پاس
چادر گلابی سر سے ڈھلکتی ہی جائے گی
گوری، حسین بیوی مری گنگنائے گی
اُجلے سے خدّ و خال جو ملتے ہیں بلخ میں
آیت لکھی ہوئی ہو کوئی خطِ نسخ میں
مسجد پکارتی ہے جو: حَیَّ عَلَی الْفَلَاح
اک روز میرا اس سے ہوا تھا وہاں نکاح
پیڑوں کے بیچ برج منارے، حسین شام
ہم کو نماز آ کے پڑھائے گا واں امام
گنبد میں گونجے لفظ، کہے تھے جو فرش پر
ہو کر کلس کی نوک سے، جائیں گے عرش پر

غلام مرتضیٰ

ہمدمِ دیرینہ نثار ترابی کی نذر

ترے سخن سے لبِ خوش مقال روشن ہے
اَدب کا ماضی و فردا و حال روشن ہے

ترا کلام ہے بیداریِ حواس و شعور
دل و دماغ و وجود و خیال روشن ہے

تری غزل ہو، تری نظم ہو یا گیت کوئی
فضائے ہجر و امیدِ وصال روشن ہے

چمکتے ہیں ترے شعروں کے اس طرح سے نقوش
کہ جوں ستارہ و بدر و ہلال روشن ہے

نہیں تھی روشنی شعر و ادب کی محفل میں
ترے کمال سے اِس کا جمال روشن ہے

غموں کی دُھند، جدائی کی تیرگی میں بھی
تمہارا حرف، سحر کی مثال روشن ہے

زاہد ربانی

نظم

بازار میں
مَیں نے اپنی انگلی ہوا میں لہرا دی
شام تک کسی نے نہیں پکڑی
یہ دیکھ کر
میں نے اپنی انگلی خود پکڑ لی
اور اپنے ساتھ پارک میں ٹہلنے نکلا
ایک قدم جاتے ہی
میں نے خود کی انگلی دور پٹخ دی
کیوں کہ
وہ مجھے وہاں لے جا رہی تھی
جہاں دو لوگ مصافحہ کر رہے تھے

میرے سامنے ایک لڑکی نے گھونسلا بنانا
شروع کیا
میں نے انہیں اپنی پلکیں دے دیں
ایک شام جب بارش ہو رہی تھی
اس نے مجھے میرا سامان واپس کر دیا
شاید اس کے گھونسلے نے دیکھنا شروع کر دیا تھا

بہار کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے
میں نے دیکھا
ایک کسان زمین کے چہرے پر استرا چلا رہا ہے

میں نے انہیں اپنا دل پیش کیا
اس نے یہ کہتے ہوئے
مجھے میرا دل واپس کر دیا
آپ کے دل سے درد کی فصل اٹھتی ہے

میرے پڑوسی نے دیوار میں گھڑیال نصب کی
میں نے انہیں ہماری ملاقات کی سوئی دے دی
ایک رات جب میں رو رہا تھا
اس نے میری آنکھوں میں سوئی گاڑ دی
یہ کہتے ہوئے
کہ ہر رات یہ اداسی کی ٹک ٹک کرتی ہے

نظم مکمل کرنے کے بعد
میں نے
اپنے مطالعے کے میز کو
اپنی ناک تحفے میں دے دی
سردی کی اک رات
جب میں تم سے واپس آ رہا تھا
میری میز اپنی جگہ نہیں تھی
شاید اس نے اذیت سونگھنی شروع کر دی تھی

م ح مسرور

جلدی کیسے ہوسکتی ہے

اعجاز رضوی

بھول گیا ہوں
سچ مچ سب کچھ بھول گیا ہوں
بچپن کیا تھا،
بچپن سے آگے بھی کچھ تھا، یاد نہیں ہے
چونسٹھ سال کا لمبا عرصہ
ریل کی سیٹی پھر ویران سا اک اسٹیشن
تانگے میں سامان کا رکھنا
ٹک ٹک ٹک ٹک سنتے سنتے یکدم سننا
پھول باغ بھی گزر گیا ہے
گھر آنے میں دیر نہیں ہے
پھر وہ ٹک ٹک ٹک ٹک یکدم ماند پڑی تو
میں تانگے سے اُترا، بھاگا، ٹھوکر کھائی، اٹھا کپڑے جھاڑے
پھر اک اونچے آوازے نے یوں دھمکایا،
او پنجابی ٹگے کس سے ملنے کی جلدی ہے
میں شرمندہ چور بنا سا، ٹھہر گیا تھا
ٹھہر گیا ہوں
لیکن اب بھی
میرے پیچھے آوازوں کا اک لشکر ہے
اور سب اونچی آوازیں مجھ سے کہتی ہیں
او پنجابی ٹگے کس سے ملنے کی جلدی ہے
میں بیچارا اُن اونچی آوازوں کو کیسے سمجھاؤں
مجھ جیسے اک سست قدم کو جلدی کیسے ہوسکتی ہے

خطوط

دردانہ نوشین خان

مکرمی السلام علیکم!

مہنگائی کے اس بدنما دور میں گھر بیٹھے ایک معیاری رسالے کا موصول ہوتے رہنا نعمت ہے یہ خالد احمد صاحب کا ادب کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

افسانہ ''حادثہ'' پڑھ کر چند ثانیے دل دھڑکنا بھول گیا یہ افسانہ تھا کردار نگاری تھی خود بیتی تھی یا حقیقت---؟

''اولڈ کیمپس کی محبت'' (حبیب الرحمٰن) بھی اداس کرنے والا ناسٹلجیا ہے تاہم مجھے لفظ ناسٹلجیا میں ماضی سے بے زاریت محسوس ہوتی ہے میں اس کے بجائے یادِ ماضی کے لفظ کو منتخب کروں گی

''میرا جسم میری مرضی'' تحریر موپاساں اور مترجم عامر رضوی--- نیچر ہماری دشمن ہے یہ ہمیں مسلسل واپس جانوروں والی زندگی میں دھکیلنے کی کوشش میں مصروف رہتی ہے۔ تحریر کے فقروں میں پوشیدہ ذہانت بھری استہزاء (taunt.) نے مجھے ورق پلٹ کر ادیب کا نام دیکھنے پر مجبور کیا--واقعی یہ موپاساں ہی ہوسکتا تھا

''نہ لکھوں گی تو مر جاؤں گی'' ایک تعزیتی تحریر سیدہ آمنہ ریاض کا دکھ دکھی کر گیا دعا کے سوا کوئی الفاظ نہیں۔

بیاض باقاعدگی سے شائع ہونے والا رسالہ ہے اس کا پابندی سے موصول ہونا خوشگوار احساس دیتا ہے۔

دعاگو

طالب انصاری

برادر مکرم جناب عمران منظور صاحب

مسنون سلام اور بہت احترام

''بیاض'' کا شمارہ بابت جون 2022 باعثِ انبساطِ دل ہوا۔ جذبات امتنان قبول فرمایئے۔ مجھے یہ کہنے میں کچھ اڑچن نہیں کہ ''بیاض'' حمد و نعت سے لے کر خطوط تک بہترین مندرجات سے بھرا ہوتا ہے۔ علی رضا اور سرور حسین نقشبندی کی نعتوں میں عقیدت کا وفور تو تھا ہی، ان نعتوں کا نمایاں وصف تازہ کاری تھا۔ سرور حسین نقشبندی کے یہ اشعار بہت اچھے لگے:

کرتے ہو کیوں گلہ کہ زمانے میں خوار ہیں
دل سے نبیؐ کی بات کو مانا تو ہے نہیں
ہم سائبانِ نعت میں رہتے ہیں اس لیے
بخشش کا کوئی اور بہانہ تو ہے نہیں

سلیمان عبداللہ ڈار موضوعات میں مخصوص صوفیانہ طرزِ فکر کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ ان کی گفتگو محبت کے موضوع پر رہی۔ ان کا اپنا طرزِ فکر ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ ہماری دنیا علّت و معلول کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے۔ ہمارا کوئی عمل، چاہے وہ محبت ہی کیوں نہ ہو، بے سبب نہیں ہوتا۔ جب کسی مرد کو کسی حسین عورت سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کے پیچھے صنفی جذبات کی کارفرمائی ضرور ہوتی ہے۔ چلیے ہم اس محبت کو پاکیزہ قرار دیتے ہوئے جنس کے جذبے کو

خارج کردیتے ہیں تو بھی ایک حسین عورت بہرطور مرد کی حسِ جمالیات کی تسکین تو کرتی ہے اور یہی اس سے محبت ہو جانے کا سبب ہے۔ ہم اللہ سے محبت بھی اس غرض کے ساتھ کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد ایک ان دیکھے جہان میں اس کا ہمارے ساتھ سلوک رحم والا ہو، نہ کہ جابرانہ۔ کہتے ہیں کہ صوفی اللہ سے بے غرض محبت کرتا ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ علت و معلول کی دنیا میں کوئی جذبے بے غرض کیسے ہوسکتا ہے۔ عین ممکن ہے صوفی کی اللہ سے ''بے غرض'' محبت میں بھی کسی نوع کی تسکین شامل ہو تسکین کی نوعیت ہر فرد میں مختلف ہوسکتی ہے۔

ابدال بیلا صاحب نے ''اولمپیا'' میں یونانی اساطیر اور اس سے وابستہ واقعات کو نہایت دل چسپ اسلوب میں بیان کیا۔ مضمون دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ معلومات افزا بھی تھا۔ بہت اچھا لگا۔ یہ ایک مکالماتی مضمون تھا، جس میں مصنف خود ہی مکالمہ کرتا ہے، مخاطب صرف سنتا ہے۔ مضمون نگاری کا یہ انداز بھی خوب ہے۔

صغیر احمد صغیر کا مختصر مضمون ''آکسی ٹوسن'' طب سے متعلق حیرت انگیز معلومات پر مبنی تھا۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ بیماری کی حالت میں کسی پسندیدہ شخصیت کے تیمارداری کی غرض سے آنے پر بیمار ہشاش بشاش ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت کو اسد اللہ غالب نے کیا ہی خوب صورت شعری پیرایہ دیا ہے:

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیگر مضامین و منظومات بھی لائقِ توجہ تھے۔ ''بیاض'' کا یہ انفراد ہے کہ اس ادبی پرچہ میں سب سے زیادہ شاعری شامل ہوتی ہے۔ سارے پسندیدہ اشعار لکھنے لگوں تو کئی صفحات لگ جائیں گے۔ چیدہ چیدہ اشعار کے اعادہ کے ساتھ تمت بالخیر:

گلاب فصلِ خزاں سے نکال لائے ہو	کہاں کی چیز کہاں سے نکال لائے ہو	اعجاز کنور راجہ
دام و درم نہیں تھے مگر سربلند تھا	سر بار دوش ہو گیا دستار بیچ کر	شکیل جاذب
اُس نے ہمیں تاریخ کے تہہ خانے میں رکھا	سو رزق اترتا رہا زینے سے ہمارا	شہزاد نیر
میں نے کہا فقیر سے بابا معاف کر	اس نے مجھے معاف کیا اور چل دیا	مسعود احمد
میرے دشمن کو فقط ایک ہی اندیشہ ہے	میرے بچے بھی نہ تلوار اٹھانے لگ جائیں	افتخار شاہد

اشرف کمال

محترم عمران منظور نعمان منظور صاحب
السلام علیکم!
جون کا شمارہ ملا۔ خوبصورت پھولوں کی ایبسٹریکٹ پینٹنگ سے آراستہ۔
حسب سابق منتخب غزلوں نظموں اور مضامین کا خوبصورت گلدستہ پیش کیا گیا ہے۔
رسالہ کھولتے ہیں آغاز میں جناب خالد احمد کی غزل کے دو دو اشعار پر مشتمل نظمیں ''بچے آہن گر کے'' اور ''یقین'' الفاظ و معنی کے لال تپتے ہوئے لوہے سے گلال، نئے در کھولتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

آگ کے تپ سے اور تپا اٹھے
خون سے تپتے گال
پھولوں جیسے ہاتھوں میں
لوہا لال گلال

اسی طرح ''یقین'' میں ہر بوند کے ساتھ ایک فرشتے کا زمین پر آنے کی خوشخبری کے باوجود غریبوں کی چھتوں کا ٹپکنا ایک الگ مزاج کا منظرنامہ کو واضح کرتا ہے۔

مرزا آصف رسول کا نعتیہ کلام ''احسن البشر'' لفظوں کی توقیر کی کہانی بیان کرتی ہے:

ذکر و شکر کا رتبہ آپ کے مکار ہیں
آپ نے بڑھائی ہیں حیثیات لفظوں کی

ان اشعار میں سماجی حوالے سے کچھ موضوعات ہیں جو جدت کا رنگ لیے ہوئے ہیں:

دیوانے نے چھوڑ دی ہے بستی — سوچا بھی ہے اب کہاں رہے گا — سحر انصاری
جونہی ہلا وہ تخت تو پھر دوسرے ہی پل — در پر غلام، راہوں میں خلقت نہیں رہی — امجد اسلام امجد
خون سے دیوار پر لکھتے رہو سچائیاں — تم بھی میری طرح پڑھ لکھ کر اگر بے کار ہو — راحت سرحدی
دو گھڑی ہجر سے رہائی دے — کون گریہ کرے، دہائی دے — ملیحہ سید
لگتا ہے تری ڈور کہیں اور بندھی ہے — جو رابطہ ٹوٹا ہے مہینے سے ہمارا — شہزاد نیر
بہت سے رشتے ہیں در و دیوار میں لپٹے ہوئے — اسی مکان سے ہم اپنا گھر نکالیں گے — محمد نوید مرزا
گرد بیٹھی تو میں نظر آیا — جسم سارا غبار تھا اپنا — فیصل ہاشمی

دیگر غزلیں بھی شعری مفاہیم کے حوالے سے خوب ہیں۔ مختلف نظمیں اپنے اپنے موضوع کی مناسبت سے ماحصل کے گرد گھومتی ہیں۔ شعر اور بھی اچھے ہیں، مضامین، ترجمہ کہانی، طنز و مزاح، خطوط اور آپ بیتی کے حوالے سے بھی تبصرہ تفصیلی وقت مانگتا ہے۔ بیاض کی وساطت سے ادب اور ادیبوں سے ملاقات کا راستہ نکلتا ہے۔ دعا ہے کہ آپ اسی طرح بیاض کے توسط سے ہمیں اعلیٰ ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے رہیں۔ وہ تمام ذہن اور تمام ہاتھ جو بیاض کے شماروں کی ترتیب میں کسی بھی قسم کردار ادا کرتے ہیں ان کی خیر ہو۔ آمین

فیض رسول فیضان

محترم المقام مدیران بیاض۔ آداب و تسلیمات۔

جُون کا شمارہ بھی حسبِ معمول معیاری ہے۔ ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار، تصوّف کے ذریعے، روشنی اور خوشبو تقسیم فرما رہے ہیں۔ آپ بیتی کے ذریعے پتہ چلتا ہے کہ شوکت علی شاہ، کتنے بُلند پایہ اور باریک بین لکھاری ہیں اور انفس و آفاق کی سیاحت اور ابلاغ پر موصوف کا کس درجہ عبور ہے۔ مباحثہ بعنوان، نقاد کی موت، پڑھ کر فکر و نظر اور انتقاد کے کئی در تیچے وا ہو جاتے ہیں۔ اپنے دو شعر یاد آئے:

تخلیق کار پھر بھی رہے گا عظیم تر — ہر چند اُس پہ کتنی ہی تنقید کیجئے

اور

تجربہ کیجئے، کتنا دُشوار ہے — تبصرہ کیجئے، کتنا آسان ہے

غافر شہزاد، مقدار و معیار کے ساتھ مساوی نباہ کرنے والے عمدہ ناول نگار ہیں جنہیں شاہدہ دلاور شاہ نے خوبصورت خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ رانا خالد محمود قیصر نے سحر تاب رومانی کے شعر و سخن پر جامع و مبسوط مضمون لکھا ہے۔ رومانی صاحب کے دو تلخ مگر سچے شعر:

داد مت دے خراب شعروں پر — خوب رُو شاعرات سے مت کھیل

اور

یہاں جتنے بھی بے بنیاد شاعر ہیں — مجھے حیرت ہے سب اُستاد شاعر ہیں

اِس پر میرا اپنا بھی ایک شعر:

خالی کاغذ پہ جو اصلاح لیا کرتے تھے — آج فیضانؔ وہ اُستاد بنے پھرتے ہیں

صفیر احمد صفیر کی مختصر تحریر، آسکیڈوسن، ان کے وسعتِ مطالعہ کی گواہی دیتی ہے۔ بقول خود:

وہ ہے لیفان طاق اس فن میں دوڑ جاتی ہے سنسنی تن میں

سیدہ آمنہ ریاض نے اپنے بھانجے کے تعزیت نامے کو محبت و مہارت سے قلم بند کیا ہے۔ رانا محمد شاہد، ہرفن مولا ہیں۔ کتاب کی واپسی کے موضوع پر ان کی شگفتہ نگاری، لطیف آئینہ ہے۔ جلیل عالی کے شاعرانہ تجزیے سے اعجاز رضوی کی تنقیدی گہرائی کی خبر ملتی ہے۔ عامر رضوی نے موپساں کے افسانے کا ترجمہ، ادبی رچاؤ اور انشائی رکھ رکھاؤ سے کیا ہے۔ الہیات پر موپساں کے خیالات، دہریت سو گنا سے کہیں زیادہ زہریلے ہیں اور شوگر کی تہوں میں سے بھی ان کی تاراج کاری و نابودگری جھلک جھلک پڑ رہی ہے۔ تاہم مترجم کی فنی ثقاہت، تسلیم شدہ ہے۔ زیر نظر شمارے کے دیگر علمیے بشمول حصہ شاعرانہ بھی خوش جمال و باکمال ہیں۔ بہرحال خیر، گذشتہ تبصرے کی عدم اشاعت کی موودبانہ یاد دہانی اور ایک نظم کے ساتھ، حضرت خالد احمد کے چند لازوال اشعار پیش کرتے ہوئے دعائیہ وسلامیہ اجازت۔

رنگ کھلتے ہیں کہانی میری
کس کی خوشبو تھی جوانی میری
کوئی پائے تو مجھے کیا پائے
کھوئے رہنا ہے نشانی میری
کوہ سے دشت میں لے آئی ہے
دشمنِ جاں ہے روانی میری
کیا سخن فہم نظر تھی جس نے
بات کوئی بھی نہ مانی میری
ناقدوں نے مجھے پرکھا خالد
خاک صحراؤں نے چھانی میری

رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور، اعجاز رضوی صاحب

السلام علیکم!

جون کے "بیاض" میں شامل سبھی کتابوں کے سرورق دیدہ زیب تھے۔ محبت کے رنگوں سے آشنا کرتی سلیمان عبداللہ ڈار کی تحریر متاثر کن تھی۔ نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غریبوں سے محبت کا ذکر پڑھتے ہوئے ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک غریب دیہاتی بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں انگوروں سے بھری ایک رکابی کا تحفہ پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ آپؐ نے رکابی لی اور انگور کھانے شروع کیے۔ پہلا تناول فرمایا اور مسکرائے۔ اس کے بعد دوسرا دانہ کھایا اور مسکرائے اور وہ بے چارہ غریب دیہاتی آپ کو مسکراتا دیکھ کر خوشی سے نہال...... صحابہ سارے منتظر، خلاف عادت جو کام ہو رہا ہے کہ ہدیہ آیا ہے اور انھیں حصہ نہیں مل رہا۔ آپ انگوروں کا ایک ایک دانہ کھائے جا رہے ہیں اور مسکرائے جا رہے ہیں۔ انگوروں سے بھری رکابی ختم ہوئی۔ آج سارے صحابہ متعجب۔ غریب دیہاتی کی تو عید ہوگئی۔ خوشی سے دیوانہ، خالی رکابی لیے واپس چلا گیا۔ صحابہ نہ رہ سکے۔ ایک نے پوچھ ہی لیا۔ یارسول اللہ! آج تو آپ نے ہمیں شامل ہی نہیں کیا؟ سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، تم لوگوں نے دیکھی تھی اس غریب کی خوشی؟ میں نے جب انگور چکھے تو پتہ چلا کہ کھٹے ہیں۔ مجھے لگا کہ اگر تمہارے ساتھ یہ تقسیم کرتا ہوں تو ہو سکتا ہے۔ تم میں سے کسی سے کچھ ایسی بات یا علامت ظاہر ہو جاتی، جو اس غریب کی خوشی کو خراب کر کے رکھ دیتی۔ "بحث برائے اردو ادب اور نقاد کی موت" اعجاز رضوی اور فیصل زمان

چشتی نے اس موضوع سے خوب انصاف کیا۔ تنقید کا وہ معیار اس لیے بھی نہیں رہا کہ ہمارے ہاں تنقید کو کتنے لوگ قبول کرتے ہیں۔ اور اچھا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ایک تخلیق کار کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ تنقید کے بغیر اس کی تخلیق بھی اس معیار کو چھو نہ پائے گی۔ تنقید لکھنے کا رواج ویسے بھی کم ہے۔ ہاں منہ سے تنقید کرنے کے لیے ہر کوئی تیار رہتا ہے۔ اس لیے کہ منہ زبانی تنقید کی کوئی ذمہ داری ہوتی ہے اور نہ ہی گرفت۔ ہمارے ہاں ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ اکثر نقاد صاحب کتاب کو جانتا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے فن پارے پر رائے دیتے ہوئے معیار میں فرق آ جاتا ہے کہ کہیں نہ کہیں کچھ لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اقبال ہلالی "اولمپیا" شاہدہ دلاور شاہ کی "کرول کہانی کے صحافتی کردار" اور اعجاز رضوی کی "جلیل عالی، ایک منظم رہنمائی" دلچسپ تحریریں تھیں۔

امجد اسلام امجد کی "غزل مسلسل" کا دوسرا شعر پڑھتے ہوئے اچھے وقتوں کے بہت سے رنگ سامنے آ گئے۔

کچھ بھی نہیں تھا پاس تو رہتے تھے جب بھی خوش
اور اب کسی بھی چیز میں لذت نہیں رہی

شعر پڑھتے ہوئے سب سے پہلے تو امجد صاحب کا پی ٹی وی کے لیے لکھا ڈرامہ "وارث" یاد آ گیا۔ گو کہ یہ وارث کی طرح مقبولیت حاصل نہ کر سکا مگر یاد آنے کی وجہ یہ تھی کہ اس سے دو سال پہلے ٹی وی خریدا تھا۔ اور دو، چار مہینے کے فرق سے فریج گھر آیا تھا۔ اس سے پہلے برف ہمسایوں سے یا پھر بازار سے لائی جاتی تھی۔ امی گھر کے کام کاج خود کرتی تھیں، گھر کے کاموں کے لیے خاتون رکھنے کا تصور تک نہ تھا۔ حالانکہ آج ان کی بیٹی ہو یا بہو سبھی کے گھر میں خواتین کام کرتی ہیں۔ سوئی گیس کا وجود نہ تھا۔ وہ گھر کے سبھی افراد کے لیے تین وقت لکڑیاں جلا کر روٹی پکاتی تھیں اور گھر کے کئی افراد کے لیے جبکہ آج دو، تین افراد کے لیے کھانا پکانا مشکل ہو جاتا ہے۔ سوئی گیس بھی ہے، مگر بیگم کہتی ہے کہ گرمی بہت ہے۔ روٹی تندور سے لے آئیں۔ امی، کے ساتھ گزرے ایام میں ان سہولیات کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، جو آج ہمیں میسر ہیں۔ زندگی کے ملے دکھوں نے امی کو کمزور کر دیا تھا، مگر وہ کام سے نہ گھبراتی تھیں، گھر کے سارے کام خود کرتی تھیں۔ آج کی خواتین جنھیں گھر کی صفائی یا کپڑے دھونے کے لیے لازمی ملازمہ چاہیے۔ وہ یہ کام خوشی خوشی کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ گزرے ایام میں لذت بھی تھی اور خوشی بھی۔ شاید سادگی تھی اور صبر و شکر جیسی نعمت بھی میسر تھی۔

اسی غزل میں آگے چل کر امجد اسلام امجد کہتے ہیں:

کہنے کو لوگ کرتے ہیں تاروں سے گفتگو
آپس میں میں بات چیت کی عادت نہیں رہی

اس شعر کو پڑھتے ہوئے وہ وقت یاد آ گیا، جب ہم مل کر اکٹھے ہوتے تھے، اکٹھے کھانا کھاتے تھے۔ ایک چینل پی ٹی وی ہوتا تھا۔ اکٹھے بیٹھ کر ڈرامہ دیکھتے تھے۔ رات کو سونے سے پہلے نیند نہ آ رہی ہوتی تو بھی ادھر ادھر کی گفتگو کر لیتے تھے۔ یعنی وقتاً فوقتاً گھر کے افراد ایک دوسرے کو میسر تھے۔ مگر آج موبائل نے ہم سے وہ لذت چھین لی ہے۔ اب تو گھر کے افراد کو آپس میں بات چیت کیے کئی دن گزر جاتے ہیں۔ ہر کوئی ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی اپنی اپنی زندگی جی رہا ہے۔ اسی غزل میں امجد صاحب کے اس شعر نے تو آنکھیں نم کر دیں۔

ماں باپ ہی کے دم سے تھے سارے معاملے
ہاتھوں کا زور، پاؤں کی جنت نہیں رہی

ماں باپ کے ساتھ گزارے بے فکری کے وہ دن یاد آ گئے۔ جب زندگی کے سارے معاملے وہ خود ہی حل کر لیا کرتے تھے۔ شکریہ امجد اسلام امجد کہ آپ نے ہمارا بچپن، ماں باپ، ہمارے زمانے یاد دلا دیے۔ وہ سادگی، رواداری، وضع داری یاد دلا دی کیونکہ اب تو آپ کے بقول یہ حال ہے کہ:

گو جانتے ہیں دور کے سیارگاں کا حال
پر اپنے ارد گرد سے نسبت نہیں رہی

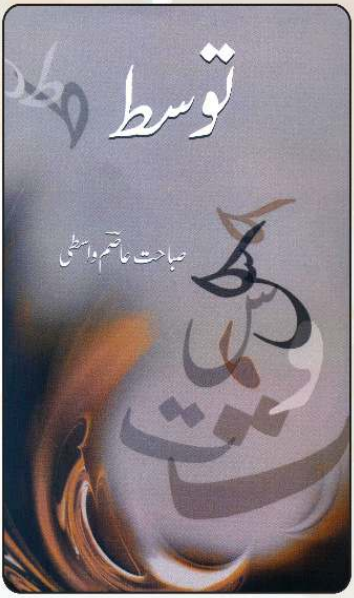
توسط
صباحت عاصم واسطی

رائیگانی
احمد محسود

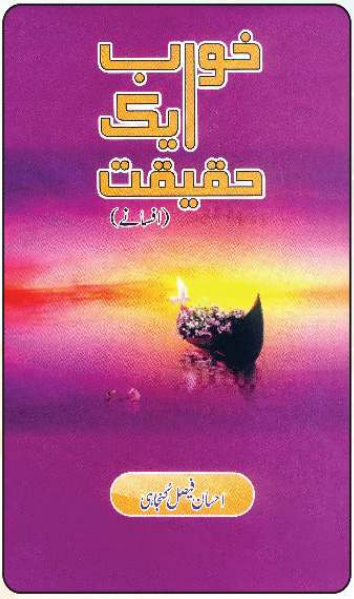
خواب ایک حقیقت
(افسانے)
احسان فیصل کھچی

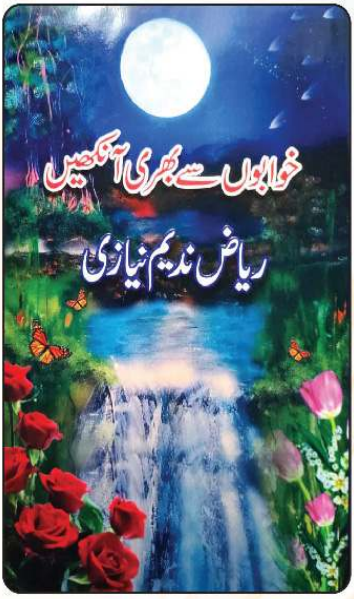
خوابوں سے بھری آنکھیں
ریاض ندیم نیازی

عيد الأضحى المبارك